قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

مئی 1967

سچے موتی

عقل کی فضیلت

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ وہ حضرت عائشہؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ اے ام المومنین! ایک شخص رات کو زیادہ سوتا ہے اور کم عبادت کرتا ہے دوسرا زیادہ عبادت کرتا ہے اور کم سوتا ہے۔ آپ کے نزدیک دونوں میں سے کون زیادہ پسندیدہ ہے۔

حضرت عائشہؓ نے فرمایا میں نے ایک دفعہ یہی سوال رسول اللہ سے کیا تھا تو آپ نے جواب دیا تھا کہ ان میں جو زیادہ عقلمند ہے وہ --- میں نے عرض کیا --- یا رسول اللہ! میں نے تو ان کی عبادت کے متعلق پوچھا تھا آپ نے فرمایا اے عائشہؓ! ان کی عقلوں کے متعلق سوال ہوگا۔ پھر جو شخص زیادہ عقلمند ہوگا وہی دنیا و آخرت میں افضل ہوگا۔

(کتاب الاذکیا — ابن جوزی)

شائع کردہ

ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ لاہور

قیمت فی پرچہ ۔ ایک روپیہ

اس کتاب کا برسوں سے انتظار تھا

اسلام کیا ہے

پرویز

ہمارا یہ دعوےٰ ہے (اور مبنی برایمان دعوےٰ) کہ اسلام، نوعِ انسان کی تمام مشکلات کا حل پیش کرتا ہے۔ لیکن جب یہ پوچھا جاتا ہے کہ اسلام ہے کیا تو مختلف گوشوں سے مختلف آوازیں اٹھتی ہیں جن کا ماحصل نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ کے مسائل سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا۔ ظاہر ہے کہ اگر اسلام صرف یہی ہے تو اس سے زندگی کے مسائل کا حل نہیں مل سکتا۔

اسلام ایک نظامِ حیات ہے جس کی بنیادیں چند غیر متبدل تصورات پر قائم ہیں۔ جب تک یہ تصورات واضح طور پر سامنے نہ آئیں، اسلام بہ حیثیت ایک نظامِ حیات کے سمجھ میں نہیں آسکتا۔ ضرورت تھی کہ ان تصورات کو واضح اور دل کش انداز میں یکجا پیش کیا جائے ——— یہ کتاب اس ضرورت کو پورا کر دیتی ہے۔

کتاب سولہ ابواب پر مشتمل ہے جن میں سے ہر باب مصنف کے مدت العمر کے مطالعہ اور تدبر فی القرآن کا ماحصل پیش کرتا ہے۔ یہ کتاب:

(۱) ہمارے مذہب گزیدہ نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ کے مطالعہ میں آجائے تو انہیں علیٰ وجہ البصیرت اسلام کا گرویدہ بنا دے۔ اور

(۲) غیر مسلموں کے ہاتھ میں دیدی جائے تو اسلام کے متعلق ان کی غلط فہمیاں دور ہو جائیں۔

کتاب قریب پونے چار سو صفحات پر مشتمل ہے۔ اور دو اقسام میں شائع کی گئی ہے۔

قسم اوّل۔ اعلیٰ سفید کاغذ، مضبوط جلد، حسین گرد پوش۔ قیمت فی جلد۔ آٹھ روپے۔

قسم دوم۔ مکینیکل پیپر بکس بورڈ کور۔ قیمت فی جلد۔ چار روپے۔

فرمائش کے ساتھ اس کی تصریح کر دی جائے کہ کونسی قسم کی جلد مطلوب ہے۔

ملنے کا پتہ: ادارہ طلوعِ اسلام - ۲۵ بی - گلبرگ - لاہور

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ

طلوعِ اسلام

لاہور

بدل اشتراک

سالانہ	پاکستان	دس روپے
سالانہ	ہندوستان	پندرہ روپے
سالانہ	غیر ممالک	ایک پونڈ

قیمت فی پرچہ

پاکستان ایک روپیہ

ہندوستان ڈیڑھ روپیہ

ٹیلیفون ۸۰۸۰۰

خط و کتابت

طلوع اسلام ۲۵۔بی گلبرگ لاہور

جلد نمبر ۲۰ مئی ۱۹۶۷ء نمبر ۵

فہرست مضامین

(۱) لمعات ---- ۲

(۲) عالم کسے کہتے ہیں؟ ---- ۹

(۳) یہ زمین کس کی ہے! ---- ۲۵

(۴) اقوام متحدہ کا عالمی کردار ---- (محترم خورشید عالم صاحب) ---- ۴۲

(۵) مجموعہ قوانینِ اسلام پر ایک نظر ---- (محترم رفیع اللہ شہاب۔ ایم۔ اے) ---- ۴۹

(۶) حقائق و عبر ---- (دین و دانش را غلام ارزاں دہد) (جمہوریت کے علمبردار) (سب کی آنکھوں میں دھول جھونکو) ---- ۶۶

(۷) باب المراسلات ---- ہماری شادیاں ---- یدعون ابناءھم ---- ۷۲

(۸) تشکریہ ---- ۷۷

(۹) رابطہ باہمی ---- ۷۹

ایڈیٹر۔ محمد خلیل۔ ناشر سراج الحق۔ مقام اشاعت۔ ۲۵ بی گلبرگ۔ لاہور۔ پرنٹر شیخ محمد اشرف۔ مطبوعہ۔ اشرف پریس ایبک روڈ۔ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ملت کا

(نظریۂ پاکستان کیا ہے؟)

دگر از سر گرفتم قصۂ زلفِ چلیپا را

آپ طلوع اسلام کے گزشتہ اُنیس سال کے فائلوں کو اٹھا کر دیکھئے، ان میں ایک موضوع آپ کو مسلسل اور متواتر سامنے آتا دکھائی دے گا۔ وہ یہ کہ قوم کی نئی نسلیں اس نظریہ سے بیگانہ ہو رہی ہیں جس پر پاکستان کی عمارت استوار ہوئی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کے دل سے، ہندوستان سے کٹ کر ایک جداگانہ مملکت کی اہمیت، بلکہ اس کے جواز تک کا احساس مٹتا جا رہا ہے۔ اس نظریہ کا مثبت تصور ان کے سامنے پیش نہیں کیا جا رہا۔ اور دوسری طرف، تخریبی قوتیں، اس کے خلاف مسلسل پراپیگنڈے میں مصروف ہیں۔ وہ ان کے کانوں میں برابر یہ افسوں پھونکے جاتی ہیں کہ ہندوستان جیسے وسیع و عریض ملک سے الگ ہو کر، ایک چھوٹی سی خود مختار مملکت قائم کر لینا نہ سیاسی اعتبار سے مفید مطلب ہو سکتا تھا، نہ معاشی اعتبار سے۔ پاکستان کی ساری مصیبتوں اور مشکلوں کا راز تقسیم ملک کی اسی بنیادی غلطی میں پنہاں ہے جو دوست نما دشمن (نظر بظاہر) اس کی تائید میں بات کرتے ہیں۔ وہ کبھی یہ کہتے ہیں کہ یہ محض ہندوؤں کی تنگ نظری کا نتیجہ تھا جو مسلمان ان سے علیحدہ ہونے پر مجبور ہو گئے ــــ گویا مطالبۂ پاکستان کا محرک جذبہ کوئی مثبت تقاضائے زندگی نہیں تھا، ہندو کی تنگ نظری کا منفیانہ ردِ عمل تھا ــــ کوئی یہ کہتا ہے کہ یہ تحریک چند دور بین سرمایہ داروں کی مفاد پرستی کی پیدا کردہ تھی جو جانتے تھے کہ غیر منقسم ہندوستان میں ان کے دولت سمیٹنے کے امکانات بہت کم ہونگے اور الگ مملکت میں ساری دولت کے واحد مالک وہی بن جائینگے۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ مطالبۂ پاکستان کی بنیاد مذہب پر تھی، ان کی طرف سے مذہب کا جو تصور پیش کیا جاتا ہے، جب نوجوان طبقہ اس پر غور کرتا ہے، تو اس کی

سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ اس کے لیے ایک الگ مملکت کی کیا ضرورت تھی؟ اس مذہب کی آزادی تو اس وقت بھی ہندوستان میں مسلمانوں کو حاصل ہے۔ اور کچھ بزرجمہر اور آگے بڑھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ قائد اعظمؒ نے مذہب کا نام محض وکیلانہ حربے کے طور پر استعمال کیا تھا۔ وہ اپنے سیاسی اقتدار کی خاطر یہ سب کچھ کر رہے تھے۔

پاکستان کی جداگانہ ہستی کے خلاف اس قسم کا مسلسل اور منظم پراپیگنڈہ، روزِ اول سے شروع تھا۔ اور طلوعِ اسلام اربابِ حل وعقد اور اصحابِ فکر و نظر کی توجہ بار بار اس طرف مبذول کرا رہا تھا کہ اگر اس کا سدباب نہ کیا گیا تو ایک دن (خاکم بدہن) پاکستان کی سالمیت ختم ہو جائے گی۔ اس کے سدباب کا طریقہ یہ ہے کہ قوم کے تعلیم یافتہ نوجوان طبقہ کے سامنے اس نظریہ کو پوری وضاحت سے پیش کیا جائے جو مطالبہ پاکستان کی بنیاد تھا اور ہمارے لئے ایک جداگانہ مملکت کی وجہ جواز ہے۔

بارے مقامِ تشکر ہے کہ صدرِ مملکت نے اس کی اہمیت کا احساس فرمایا۔ چنانچہ انہوں نے انجمن حمایت اسلام لاہور کی ڈائمنڈ جوبلی کی تقریب پر اپنے صدارتی خطبہ میں کہا۔

> پچھلی ایک صدی میں اس برصغیر کے مسلمان جن آزمائشوں سے گزرتے رہے ہیں، پاکستان بن جانے کے بعد وہ تاریخ کا حصہ بن چکے ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ وہ پس منظر بھی دھندلا پڑتا جا رہا ہے، جس میں مسلمانوں کی بقا کے لئے پاکستان کی تحریک ہمارے لئے زندگی اور موت کا سوال بن گئی تھی۔ ماضی کے ان حالات کو جتنی دفعہ دہرایا جائے اتنا ہی کم ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ نہایت ضروری ہے کہ ہماری آنے والی نسلوں کو پاکستان بننے کے صحیح پس منظر سے اچھی طرح آگاہ رکھا جائے تاکہ ان کے ذہن میں پاکستان کی ضرورت، پاکستان کی افادیت اور پاکستان کی سالمیت کی قدر وقیمت اچھی طرح زندہ رہے۔ (بحوالہ مشرق۔ ۲۷ مارچ ۱۹۶۷ء)

اس کے بعد صدرِ محترم نے ملک کے نصابِ تعلیم میں تغیر و تبدل کے سلسلے میں یہ مشورہ دیا ہے کہ تحریکِ پاکستان کی تاریخ کو اس طرح مرتب کیا جائے کہ پاکستان کا بنیادی نظریہ، اجاگر ہو کر سامنے آجائے۔ یہ تجویز بڑی مبارک و مسعود ہے۔ خدا کرے کہ یہ تکمیل تک پہنچ جائے۔

پاکستان کا نظریہ کیا ہے؟ اس کے متعلق کہنے کو تو دو لفظوں میں کہا جا سکتا ہے (اور یہی بالعموم کہا بھی جاتا ہے) کہ یہ نظریہ اسلام ہے۔ لیکن یہی نہیں کہ اتنا کہہ دینا کافی ہے۔ بلکہ اس سے یہ مسئلہ صاف ہونے کی بجائے اور بھی پیچیدہ اور پریشان کن بن جاتا ہے۔ اس لئے کہ ہمارے ہاں یہی متعین نہیں کہ اسلام کا مفہوم کیا ہے۔ ہر شخص (اور ہر جماعت) کا اسلام کا تصور جداگانہ ہے۔ یہی وجہ تھی کہ صدر مملکت نے اپنے (محولہ بالا) خطبہ میں اس کی وضاحت کر دی کہ

اس احساس کو صحیح معنوں میں قائم رکھنے کے لئے صرف یہ کہہ دینا کافی نہیں کہ پاکستان ایک نظریاتی ملک ہے اور اسلام اس کا نصب العین ہے۔

نظریۂ پاکستان کیا ہے، اس کے متعلق بات ذرا پیچھے سے شروع کرنی پڑے گی کیونکہ اس تمہید کے بغیر یہ نظریہ سمجھ میں نہیں آسکتا۔ قرآن کریم نے دین کا یہ بنیادی تصور پیش کیا ہے کہ جس طرح خارجی کائنات میں نظام فطرت غیر متغیر قوانین کے مطابق سرگرم عمل ہے، اسی طرح انسانی زندگی کے لئے بھی کچھ غیر متبدل ابدی اصولوں کی ضرورت ہے۔ یہ اصول خدا کی طرف سے حضرات انبیاء کرام کی وساطت سے (بذریعہ وحی) دیئے جاتے تھے۔

اصول یا قوانین، نظری طور پر محض ایک فارمولا کی حیثیت رکھتے ہیں جس طرح، جب تک ایک فارمولا کو عمل میں نہ لایا جائے وہ اپنے نتائج پیدا نہیں کرتا۔ اسی طرح جب تک وحی کی رُو سے عطا کردہ اصول و قوانین کو انسانی معاشرہ میں عملاً رائج نہ کیا جائے، نہ ان کی افادی حیثیت سامنے آسکتی ہے اور نہ ہی وہ اس مقصد کو پورا کرسکتے ہیں جس کے لئے انہیں وضع کیا گیا ہے۔ لہٰذا حضرات انبیاء کرام ان اصول و قوانین کو انسانوں تک پہنچاتے ہی نہیں تھے بلکہ انہیں معاشرہ میں عملاً رائج بھی کرتے تھے۔ اس کا طریق یہ تھا کہ وہ پہلے ان اصولوں کی صداقت کو دلائل و براہین کے ساتھ، لوگوں کے سامنے پیش کرتے۔ جو لوگ، اس طرح ان کی حقانیت کے (دل اور دماغ کے کامل اطمینان کے بعد) معترف ہو جاتے، وہ باقی معاشرہ سے کٹ کر، ایک الگ جماعت کے افراد بنتے جاتے۔ اس طرح اس ملک میں دو الگ الگ جماعتیں وجود میں آجاتیں۔ ایک ان افراد پر مشتمل جماعت جو ان ابدی اصول و اقدار کی صداقت پر یقین رکھتے، دوسری ان افراد سے مرکب جو ان کی صداقت سے انکار کرکے، اپنے تصور کے مطابق زندگی بسر کرتے۔ دور حاضر کی اصطلاح میں یوں کہیئے کہ اس نظریہ کی رُو سے، قومیت کا معیار آئیڈیالوجی کا اشتراک تھا، رنگ، نسل، زبان، وطن کا اشتراک نہیں۔ یعنے ایک ملک میں بسنے والے، ایک زبان بولنے والے، ایک ہی نسل کے افراد میں سے جو لوگ اس آئیڈیالوجی کو تسلیم کریں جو قوانین خداوندی پر مشتمل ہے، وہ ایک قوم کے افراد، اور جو لوگ اس آئیڈیالوجی کو صحیح تسلیم نہ کریں، وہ دوسری قوم کے افراد۔

اس طرح، ایک جداگانہ جماعت (یا قوم) کی تشکیل کے بعد، اگلا مرحلہ یہ آتا ہے کہ یہ قوم اپنے معاشرہ میں ان قوانین کو عملاً رائج کرے۔ ظاہر ہے کہ ایک خطۂ زمین میں خاص قوانین اسی صورت میں نافذ ہو سکتے ہیں جب اس ملک میں، ان قوانین کی حامل جماعت کو سیاسی اقتدار حاصل ہو۔ چنانچہ یہ جماعت کوشش کرتی کہ وہ جس ملک میں سکونت پذیر ہے اسے وہیں اس قسم کا اقتدار حاصل ہو جائے۔ لیکن اگر ایسا نہ ہو سکتا تو وہ کسی ایسے خطۂ زمین کی طرف منتقل ہو جاتی جہاں اس قسم کے اقتدار کے لئے فضا زیادہ سازگار ہوتی۔

(اس طرح کی ـــ یعنی اس مقصد کے لئے ـــ نقل مکانی کو دین کی اصطلاح میں ہجرت کہتے ہیں) اُس سرزمین میں یہ جماعت ایسا معاشرہ تشکیل کرتی جو ان قوانین پر مبنی ہوتا۔ قوانینِ خداوندی کے اس طرح عملاً نافذ ہو جانے کا نام دین ہے۔ اسی کو الاسلام بھی کہا جاتا ہے۔ یعنی قوانینِ خداوندی کے سامنے عملاً جھک جانا۔ عصرِ حاضر کی اصطلاح میں یوں کہا جائے گا کہ اسلام کے ایک زندہ دین بننے کے لئے اپنی آزاد مملکت کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ مملکت خدا کے عطا کردہ اصولوں کو اپنے زمانے کے حالات کے مطابق عملاً نافذ کرنے کی ایجنسی ہوتی ہے۔ اسلئے اسے بعض اوقات حکومتِ خداوندی سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔

ایک رسول آتا اور اس طرح وحی کی رُو سے عطا شدہ اصولوں کے مطابق، ایک معاشرہ متشکل کر کے دنیا سے چلا جاتا۔ یہی رسالت کا مقصود تھا اور اسی کا نام دین ـــ اس دین (یا حکومتِ خداوندی) میں انسانوں پر حکومت کرنے کا اقتدار و اختیار کسی کو حاصل نہیں ہوتا تھا۔ کیونکہ اس میں نظامِ مملکت کا فریضہ خدا کے وضع کردہ اصول و قوانین کو نافذ کرنا ہوتا تھا، اپنا حکم چلانا نہیں۔ نہ ہی اس میں کوئی انسان روٹی کے لئے دوسرے انسانوں کا محتاج ہوتا تھا۔ کیوں کہ حکومت کا مقصود ربوبیت عالمین تھا یعنے تمام نوعِ انسانی کی پرورش اور ان کی انسانی صلاحیتوں کی نشوونما۔ عصرِ حاضر کی اصطلاح میں یوں سمجھیئے کہ اس مملکت میں نہ ملوکیت ہوتی تھی (خواہ اس کی شکل کوئی بھی کیوں نہ ہو) نہ مذہبی پیشوائیت۔ نہ سرمایہ داری ہوتی تھی نہ زر پرستی۔ اس میں کسی انسان کو کسی دوسرے انسان پر کسی قسم کا اقتدار اور اختیار نہیں ہوتا تھا۔ قرآن کریم نے دین کے دور کی (یعنے جس زمانے میں دین کا دور دورہ ہو اس کی) تعریف ان الفاظ میں پیش کی ہے کہ ـــ یَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْئًا ۔ وَالْأَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِّلَّهِ ۔ (۸۲/۱۹) جس دور میں کسی شخص کا کسی دوسرے پر کوئی اختیار اور اقتدار نہیں ہوگا۔ اور تمام معاملات اقتدارِ خداوندی کے مطابق طے ہونگے۔

رسول اس قسم کا معاشرہ متشکل کر کے چلا جاتا۔ لیکن اس کے بعد، مفاد پرست قومیں پھر سر ابھارتیں اور اپنے چھنے ہوئے اقتدار کی بازیابی کے لئے سازشیں شروع کر دیتیں۔ یہ سازش مذہبی پیشوائیت کے بغیر کامیاب نہیں ہو سکتی تھی۔ مذہبی پیشوائیت، نظامِ دینی کے ارکان کو تو اسی شکل میں رکھتی، لیکن ان کی غرض و غایت اور مقصود و منتہا کو یکسر بدل ڈالتی۔ وہ لوگوں کے دل میں اسی عقیدہ کو راسخ کرتی کہ دین کا مقصد خدا اور بندے کے درمیان ایک پرائیویٹ تعلق قائم کرنا ہوتا ہے۔ جوگیان دھیان، پوجا پاٹ، بھگتی اور پرستش سے ہوتا ہے۔ دنیاوی جاذبیتیں اس روحانی تعلق کی راہ میں حائل ہوتی ہیں اس لئے جس قدر انسان دنیا سے دور بھاگے اسی قدر وہ خدا کا مقرب بن جاتا ہے۔ اس کا

طریقہ یہ ہے کہ تم ان قواعد وضوابط اور رسوم وآئین کی پابندی کرتے جاؤ جو ہم بتائیں۔ وہ عوام کو اس طرف لگا دیتے اور صاحبِ اقتدار طبقہ کو کھلی چھٹی مل جاتی کہ وہ جو جی میں آئے کریں۔ اس طرح قوم میں دو متوازی اقتدار قائم ہو جاتے ـــــ ایک اربابِ اقتدار کا ـــــ جسے حکومت کہئے اور دوسرا مذہبی پیشوائیت کا جسے شریعت کہتے ہیں۔ اس شریعت کی پابندی، ہر حکومت کے تابع اور ہر جگہ ہو سکتی۔ اس کے لئے نہ کسی جداگانہ قوم کی ضرورت ہوتی نہ الگ مملکت کی۔ دین کی اس مسخ شدہ شکل کو مذہب (یا RELIGION) کہا جاتا ہے۔ مختصر الفاظ میں یوں کہیے کہ خدا کی طرف سے دین ملتا، مذہبی پیشوائیت اسے مذہب میں تبدیل کر دیتی، پھر خدا کا ایک اور رسول آجاتا اور وہ مذہب کی جگہ دین کا نظام قائم کر جاتا۔ یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہا تاآنکہ خدا کا آخری رسولؐ، دین کو اس کی حقیقی شکل میں قائم کرنے کے لئے، سرزمین حجاز میں مبعوث ہوا۔ اس نے، پہلے آئیڈیاجی کے اشتراک کی بنا پر، خود مکہ میں ایک جدید قوم (جماعت مومنین) کی بنیاد ڈالی۔ وہاں کے مذہبی پیشواؤں، پنچائتی سربراہوں، اور قریش کے سرمایہ پرست تاجروں نے اس نظامِ نو کی سخت مخالفت کی جس کی وجہ سے اس جماعت کو مدینہ کی طرف ہجرت کرنی پڑی۔ وہاں انہوں نے اپنی آزاد مملکت قائم کی اور اس طرح اسلام ایک زندہ دین کی حیثیت سے دنیا کے سامنے آگیا۔

نبی اکرمؐ کی دنیا سے تشریف براری کے تھوڑا عرصہ بعد، رفتہ رفتہ، دین پھر مذہب میں تبدیل ہو گیا اور مسلمانوں کے ہاں بھی نظامِ خداوندی کی جگہ انسانوں کی حکمرانی اور مذہبی پیشوائیت کی فرمانروائی نے لے لی۔ اُسوقت سے لیکر اسوقت تک مسلمانوں کے تمام ملکوں میں یہی صورتِ حال ہے۔ یعنی ہر جگہ انسانوں کی حکومت اور مذہب کی کارفرمائی ہے۔ دین کہیں بھی نہیں۔

ختمِ نبوت کے بعد، مذہب کو دین سے بدلنے کے لئے کسی نبی نے نہیں آنا تھا۔ یہ کام افرادِ امت ہی نے کرنا تھا جن کے پاس خدا کا ضابطۂ حکومت (یعنے قرآن کریم) محفوظ ہے (ختمِ نبوت اور حفاظتِ کتاب لازم وملزوم ہیں) ہندوستان میں یہ آواز علامہ اقبال نے بلند کی۔ تفصیل اس اجمال کی یوں ہے، کہ اس ملک میں، مسلمانوں کی سلطنت چھن جانے کے بعد انگریزوں کی حکومت آگئی۔ اس میں مسلمانوں کو مذہبی آزادی حاصل تھی۔ اس لئے مذہبی پیشوائیت مطمئن تھی کہ اسلام کا منشا پورا ہو رہا ہے۔ اس کے بعد، حالات نے ایسا پلٹا کھایا کہ انگریز یہاں سے چلتا دکھائی دیا۔ ہندو نے اس موقعہ کو غنیمت سمجھا اور یہاں یہ پراپیگنڈا شروع کر دیا کہ ملک کو آزادی ملنی چاہیئے۔ انگریز کے چلے جانے کے بعد یہاں کے رہنے والوں کی اپنی حکومت، بانداز جمہوریت قائم ہونی چاہیئے۔ "جمہوریت" کے معنی ہوتے ہیں اُس جماعت کی حکومت جو اکثریت میں ہو۔ آبادی کے لحاظ سے ہندو کی یہاں بہت بڑی اکثریت تھی اس لئے یہاں جمہوری نظام

کے معنی تھے ہندو کی مستقل حکومت۔ اس نے مسلمانوں کو اس کا اطمینان دلا دیا کہ اس حکومت میں مسلمانوں کو کامل "مذہبی آزادی" حاصل ہوگی۔ ہماری مذہبی پیشوائیت کو اتنا ہی چاہیئے تھا وہ اس پر رضامند ہو گئی۔ اور یوں ملک میں "ہندو حکومت" کی تحریک چلائی گئی اور اسے آزادیٔ ہند کا نقاب اوڑھا دیا گیا۔

علامہ اقبالؒ کی فراستِ قرآنی نے اس دور رس خطرہ کو بھانپا۔ اور محسوس کیا کہ اگر ہندو اس سازش میں کامیاب ہو گیا تو مسلمان کس طرح بدترین قسم کی ذلت آمیز غلامی میں گرفتار ہو جائے گا۔ اس کے ساتھ انہوں نے اس کا اندازہ بھی لگا لیا کہ اگر ہندو کے ان عزائم کو شکست دے دی جائے تو اسلام کو کس طرح موقعہ مل سکتا ہے کہ وہ یہاں زندہ دین کی شکل میں متشکل ہو جائے۔ اس کے لئے انہوں نے (پیغمبرانہ طریق کے اتباع میں) پہلے یہ اعلان کیا کہ ــــ بنا ہمارے حصارِ ملت کی اتحادِ وطن نہیں ہے ــــ یعنی اسلام میں قومیت کا مدار اشتراکِ وطن نہیں۔ آئیڈیالوجی کا اشتراک ہے مسلمان، بربنائے دین، ہر غیر مسلم سے الگ ایک جداگانہ قوم کے افراد ہیں۔ اس کے بعد انہوں نے مغرب کی اس جمہوریت کو بے نقاب کیا جسے ہندو عین آزادی بنا کر پیش کر رہا تھا۔ انہوں نے کہا کہ

دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری

پھر انہوں نے دین سے الگ ہٹ کر سیکولر نظام حکومت کے متعلق واشگاف الفاظ میں بتایا کہ ــ جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی ــــ اور اسکے ساتھ ہی انہوں نے مذہبی پیشوائیت کے اس فریب کے پردے کو چاک کیا جس کی رو سے وہ کہتے تھے کہ آزاد ہندوستان میں مسلمان کو کامل مذہبی آزادی حاصل ہوگی۔ انہوں نے کہا کہ ؎

مُلا کو جو ہے ہند میں سجدہ کی اجازت
ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد!

انہوں نے کہا کہ اسلام میں حکومت کا تصور یہ ہے کہ

سروری زیبا فقط اس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی باقی بتانِ آذری!

اور اس کی عملی شکل یہ ہے کہ ؎

گر تو می خواہی مسلماں زیستن ٭ نیست ممکن جز بقرآں زیستن

دین کے اس تصور کے ماتحت انہوں نے ایک الگ خطۂ زمین میں مسلمانوں کی آزاد مملکت کا تصور دیا

اسی کو پاکستان کا تصور کہتے ہیں۔ اسی تصور کے لئے کر قائد اعظم محمد علی جناح آگے بڑھے۔ وہ بھی پہلے دن سے آخر تک اس عظیم حقیقت کو دہراتے رہے کہ

> اسلام میں حق حکومت نہ کسی فرد کو حاصل ہے نہ افراد کی جماعت کو۔ یہ حق صرف خدا کو حاصل ہے جس کی عملی شکل اس کی کتاب کے مطابق نظام مملکت کا قیام ہے۔ اسلامی مملکت، قرآن کے اصول و قوانین کے نافذ کرنے کی ایجنسی ہوتی ہے۔
>
> (حیدر آباد میں ایک سوال کا جواب ۱۹۴۱ء میں)

اور اسی مقصد کے لئے بالآخر پاکستان حاصل کر لیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے اس کا بھی اعلان کر دیا کہ پاکستان میں نہ تھیاکریسی (مذہبی پیشواؤں کی حکومت) کے لئے کوئی گنجائش ہوگی، نہ نظام سرمایہ داری کے لئے۔

یہ ہے نظریۂ پاکستان — یعنی ایک ایسی آزاد مملکت کا قیام جس میں خدا کے عطا کردہ اصول و قوانین کی حکمرانی ہو۔ یہ ٹھیک ہے کہ اپنی آزاد مملکت میں مسلمانوں کو معاشی مفاد بھی زیادہ حاصل ہو سکتے تھے۔ اور مادی اسباب و وسائل بھی مقابلۃً زیادہ۔ لیکن یہ تصورات نہ تو تحریک پاکستان کے محرک تھے اور نہ اس مملکت کے بنیادی مقاصد۔ اس کا محرک جذبہ فقط یہ تھا کہ ایک ایسا خطۂ زمین حاصل ہو سکے جس میں مسلمان آزادانہ خدا کی عطا کردہ اقدار و اصولات کے مطابق زندگی بسر کرنے کے قابل ہو سکیں۔ یہ ہے مسلمان کی صحیح آزادی جو اسے کسی اور حکومت میں مل ہی نہیں سکتی۔ اسی سے مسلمان، باقی دنیا سے الگ ایک متمیز قوم بنتے ہیں، اور یہی ان کی الگ مملکت کے قیام کی وجہ جواز ہے۔ اس میں نہ ہندو کی تنگ نظری یا کشادہ ظرفی کا کوئی سوال تھا نہ انگریز کی مصلحت کوشی کو کسی قسم کا دخل۔ یہ ہمارے دین کا بنیادی تقاضا تھا۔

اگر پاکستان کا یہ نظریہ سامنے نہ ہو تو پھر تقسیم ہند کی کوئی دلیل نہ وقیع قرار پا سکتی ہے، نہ اطمینان بخش۔ ضرورت اس کی ہے کہ اس بنیادی حقیقت کو قوم کی نئی نسل کے سامنے واضح انداز میں پیش کیا جائے۔ اور تحریک پاکستان کی تاریخ اس طرح مرتب کی جائے کہ اس میں یہ حقیقت محوری حیثیت اختیار کرے اور باقی تفصیلات سب اسی محور کے گرد گردش کریں۔ اسی میں پاکستان کی سالمیت کا راز پوشیدہ ہے اور اسی سے ہماری عزت و آبرو اور سرفرازی و سربلندی کا رشتہ پیوست!

اگر باو نرسیدی تمام بولہبی است

عالِم کسے کہتے ہیں؟

ہمارے ہاں علماء کا طبقہ ایک مخصوص گروہ کا نام ہے۔ ان کا علم (جو کچھ بھی وہ ہے) باقی معاشرہ سے بالکل الگ۔ ان کی وضع قطع دوسروں سے یکسر مختلف، ان کا اندازِ زیست نرالا۔ ان کی ذہنیت مخصوص۔ وہ اپنے آپ کو خدا کا نائب، مسندِ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا وارث، اور انبیائے بنی اسرائیل کا مثیل سمجھتے ہیں۔ معاشرہ کے باقی افراد سب "دنیا دار" اور یہ دیندار ہیں۔ وہ فاسق و فاجر اور یہ خدا پرست ہیں۔ یہ ایک کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے اور حقارت کی نظروں سے دھتکارتے ہیں۔ ان کے نزدیک باقی سب لوگ جہنم کا ایندھن ہیں اور جنت صرف ان کی میراث ہے۔ اس سے بھی آگے بڑھئے تو ان کے نزدیک باقی ساری دنیا جاہل ہے اور صرف یہ عالم ہیں۔ ان کو ہر ایک پر تنقید کرنے کا حق حاصل ہے لیکن کسی کو اس کی جرأت و اجازت نہیں کہ ان کے کسی قول اور فعل پر تنقید کر سکے۔ اور اب تو ان کا دعویٰ یہ بھی ہے کہ ملک کا اقتدار بھی انہی کے ہاتھوں میں ہونا چاہیئے کیونکہ پاکستان کو اسلامی مملکت بننا ہے اور اس کا علم ان کے سوا کسی کو نہیں ہو سکتا کہ اسلامی مملکت کسے کہتے ہیں اور احکامِ شریعت کیا ہوتے ہیں۔

لیکن سوال یہ ہے کہ کیا قرآن کریم بھی انہیں عالم تسلیم کرتا ہے یا اس کے نزدیک علم کی تعریف کچھ اور، اور علماء کا تصور اس سے مختلف ہے؟ قرآن اس سوال کا جواب بڑی تفصیل سے دیتا ہے کہ علم کسے کہتے ہیں، اور علماء کہلانے کے مستحق کون لوگ ہیں۔ لیکن اس سوال تک پہنچنے سے پہلے چند الفاظ تمہیداً ضروری ہیں۔

علم کی دنیا میں حکمائے یونان کا جو مقام ہے اس سے آپ واقف ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت تک انسانیت کی جس قدر تاریخ ہمارے سامنے آ چکی ہے اس میں علم و حکمت کی داستان کا آغاز ہی درحقیقت یونان سے ہوتا ہے۔ اس میں سقراط (SOCRATES) کو ابوالآباء اور افلاطون (PLATO) کو اس کے بہترین شارح، اور بجائے خویش ایک مکتبِ فکر کے مؤسس کی حیثیت حاصل ہے۔ لیکن سقراط صرف انسان کو قابلِ مطالعہ سمجھتا

سمجھتا ہے۔ کائنات کو نہیں۔ اور افلاطون عالمِ محسوس کے وجود پر ہی خطِ تنسیخ کھینچ دیتا ہے اس کا خیال ہے کہ یہ کائنات جو ہمیں اس طرح محسوس (CONCRETE) دکھائی دیتی ہے، اپنا وجود ہی نہیں رکھتی۔ اصلی اور حقیقی کائنات عالمِ مثال (WORLD OF IDEAS) میں ہے اور یہ مرئی (VISIBLE) کائنات اس حقیقی دنیا کا عکس ہے لہٰذا اس کائنات کے متعلق جو علم، حواس (SENSES) کے ذریعے حاصل کیا جاتے۔ یعنی (PERCEPTUAL KNOWLEDGE) وہ قابلِ اعتماد ہی نہیں۔ یقینی علم وہ ہے جو آنکھیں اور کان بند کر کے، عالمِ تصور میں حاصل کیا جاتے۔ افلاطون کا یہی فلسفہ ہے جس پر یونانی تصوف کی عمارت استوار ہوئی۔ اسی نے ہندوستان میں

تصوّف پہنچ کر ویدانت کی شکل اختیار کی۔ چنانچہ ہندو فلسفہ کی رُو سے پرا کرتی (مادی دنیا) مایا (فریب) ہے۔ یہ سب برہما کا سپنا (خدا کا خواب) ہے۔ یہ ایشور کی لیلا ہے۔ یعنی ناٹک کا کھیل جس میں کوئی شے حقیقی نہیں ہوتی، بلکہ حقیقت کی تمثیل ہوتی ہے۔ نہ بادشاہ بادشاہ ہوتا ہے، نہ غلام، غلام، نہ دریا، دریا ہوتا ہے، نہ پہاڑ، پہاڑ۔ یہ سب فریبِ نگاہ ہوتا ہے۔ اسی بنا پر ہندو فلسفہ کی رُو سے خدا کو نٹ راج کہا جاتا ہے۔ یعنی نٹوں (ایکٹروں، کھلاڑیوں) کا بادشاہ! اس مقام پر ضمناً یہ بھی سمجھ لینا چاہیئے کہ کائنات کو اس طرح باطل قرار دینے کا نتیجہ تھا کہ اس کی طرف سے انسان کے دل میں منفی اسلوب (NEGATIVE ATTITUDE) پیدا ہو گیا۔ یہی منفیانہ اندازِ نگاہ تھا جس نے "خدا پرست" انسانوں کی نگاہ میں دنیا کو قابلِ نفرت بنا دیا۔ یہی فلسفہ ہے جو ایرانی تصوف کے راستے مسلمانوں میں بھی آگیا۔ اور ان کی زندگی کے ہر گوشے کو متاثر (اور مسموم) کر گیا۔ ہمارے تصوف کی ساری عمارت اسی بنیاد پر قائم ہے۔ اور ہماری شاعری چونکہ اسی تصوف کی نقیب ہے اس لئے ہمیں بھی قدم قدم پر اس قسم کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ کبھی سقراط کے اتباع میں یہ کہا جاتا ہے کہ ؎

ستم است گر ہوست کشد کہ بہ سیرِ سرو و سمن درا
تو زغنچہ کم نہ دمیدۂ درِ دل کشا بہ چمن درا (بیدلؔ)

اور کبھی افلاطون کے تتبع میں یہ کہ ؎

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسدؔ
عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

اور اسی سے ہمارے ہاں بھی دنیا قابلِ نفرت سمجھی جانے لگی۔ (یہ الگ موضوع ہے جس کے متعلق ہم بہت کچھ لکھ چکے ہیں۔)

بہرحال ہم کہہ یہ رہے تھے کہ قرآن سے پہلے کائنات سے متعلق نظریہ یہ تھا کہ اس کا حقیقی وجود کچھ نہیں۔

یہ محض تخیل ہے، سراب ہے، سایہ ہے، وہم ہے، گمان ہے اور جب کائنات وہم و فریب ہے تو اس کے متعلق علم بھی درحقیقت علم نہیں، ظن و گمان ہے۔ قرآن آیا اور اس نے (ہر باطل تصور کی طرح) افلاطون کے اس طلسم کی بھی دھجیاں بکھیر کر رکھ دیں۔ اس نے تصوف اور ویدانت کے نظر فریب تخیلات میں الجھی ہوئی انسانیت کو للکار کر پکارا اور کہا کہ وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا بَاطِلًا۔ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے ہم نے اسے باطل پیدا نہیں کیا۔ ذٰلِكَ ظَنُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا۔ یہ ان لوگوں کا ظن و خیال اور وہم و گمان ہے جو حقیقت سے انکار کرتے ہیں۔ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنَ النَّارِ (۳۸/۲۷)۔ اور جو لوگ اتنی بڑی حقیقت سے انکار کریں۔ (اور دنیا کو باطل اور قابلِ نفرت ٹھہرا دیں) تو ان کے اس انکار کا نتیجہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ ان کی سعی و عمل کی کھیتیاں جھلس کر رہ جائیں۔ آپ نے غور کیا کہ قرآن نے ایک آیت میں صدیوں کے غلط تصور کو کس طرح جڑ بنیاد سے اکھیڑ کر رکھ دیا ہے اور اس کے انسانیت سوز نتائج کو کس طرح بے نقاب کر دیا ہے؛ پھر اس پر بھی غور کیجئے کہ قرآن نے کائنات کو باطل قرار دینے اور اس کی طرف سے منفیانہ تصور رکھنے والوں کو "کافر" کہہ کر پکارا ہے۔ آپ نے سوچا کہ قرآن کی رُو سے کفر اور ایمان کی حدیں کہاں تک چلی جاتی ہیں۔ اور کافر و مومن کے امتیازی خصائص کیا ہیں؛ اور پھر یہ جو کہا کہ اس قسم کے منفیانہ اندازِ نگاہ کا نتیجہ یہ ہوتا ہے، کہ انسانیت کی مزرعِ ہستی جل کر راکھ ہو جاتی ہے، تو یہ کتنی بڑی تاریخی حقیقت کا بیان ہے؛ کائنات کے متعلق منفیانہ اندازِ نگاہ کا مظہر مسلکِ خانقاہیت ہے۔ اسی کو ویدانت اور تصوف کہتے ہیں۔ آپ اس مسلک کی تاریخ پر غور کریں اور دیکھیں کہ اس راستہ میں انسانوں نے جس قدر جانکاہ مشقتیں اٹھائیں .... اور سر طلب ریاضتیں کیں ان کا نتیجہ اس کے سوا اور کیا نکلا کہ انسان کی عمرانی زندگی کی ہری بھری شاخیں جھلس کر رہ گئیں۔

یہ تو تھا کائنات کو باطل قرار دینے والوں کے خلاف اعلانِ جنگ۔ اس کے بعد مثبت انداز میں کہا کہ خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ"۔ حقیقت یہ ہے کہ خدا نے اس پست و بلند کائنات کو بالحق پیدا کیا ہے یہ حقیقت پر مبنی (REAL) ہے، فریبِ تخیل نہیں۔ یہ یکسر تعمیری مقاصد کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ تخریبی نتائج کے لئے نہیں۔ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ (۲۹/۴۴)۔ اس انکشافِ حقیقت میں جو قرآن نے کیا ہے، علم و آگہی کی بہت بڑی نشانی ہے ان لوگوں کے لئے جو اس پر یقین رکھتے ہیں۔ آپ دیکھئے! سابقہ آیت میں کائنات کو باطل قرار دینے والوں کو کافر کہا گیا ہے۔ زیرِ نظر آیت میں اسے حق سمجھنے والوں کو مومن قرار دیا گیا ہے۔

کائنات کو "ایشور کی لیلا" قرار دینے والوں کے نظریہ کے ابطال میں کہا کہ وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ (۴۴/۳۸)۔ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے ہم نے اسے یونہی کھیلتے ہوئے پیدا نہیں کیا۔ تخلیقِ کائنات ایک نہایت اہم (SERIOUS) پروگرام کا جزو ہے کھیل تماشہ نہیں۔ اسے

بالحق پیدا کیا گیا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قرآن اپنے اس دعویٰ کو (کہ کائنات بالحق پیدا کی گئی ہے) یونہی منوانا چاہتا ہے یا علم و برہان کی رو سے تسلیم کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ قرآن اپنے ہر دعوے کو علم و برہان کی بنیادوں پر پیش کرتا اور فکر و بصیرت کی رو سے ماننے کی تاکید کرتا ہے۔ چنانچہ اس ضمن میں بھی اس نے واضح الفاظ میں کہہ دیا ..... کہ يُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ۔ (۱۰/۵) ہم ان حقائق کو ان لوگوں کے لئے کھول کھول کر بیان کرتے ہیں جو علم رکھتے ہیں۔

علم کی قرآنی تعریف

یہاں سے یہ سوال سامنے آتا ہے کہ علم کسے کہتے ہیں؟ قرآن اس باب میں کہتا ہے کہ وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ۔ یاد رکھو! جس بات کا تمہیں علم نہ ہو، اسکے پیچھے مت لگا کرو۔ آیت کا اتنا حصہ بھی کچھ کم حقیقت کشا اور بصیرت افروز نہیں لیکن اسکے بعد کے چند الفاظ نے علم کی ایک ایسی تعریف (DEFINITION) دے دی ہے جس سے ساری بات نکھر کر سامنے آجاتی ہے۔ فرمایا، اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا۔ (۱۷/۳۶)۔ یہ حقیقت ہے کہ تمہاری سماعت، بصارت اور فؤاد۔ ہر ایک پر ذمہ داری عاید ہوتی ہے۔ آپ نے غور کیا کہ بات کیا ہوئی؟ قرآن سمع (سننے) اور بصر (نگہ بصیرت سے دیکھنے) کو انسانی حواس (SENSES) کے معنوں میں استعمال کرتا ہے اور فؤاد وہ چیز ہے جسے دور حاضر کی اصطلاح میں (MIND) کہا جاتا ہے۔ انسانی حواس (سمع و بصر) معلومات (DATTA) فراہم کر کے انسانی فؤاد (Mind) تک پہنچاتی ہیں، اور فؤاد ان سے استنباط نتائج کرتا ہے۔ ہم کارتوس کی آواز سنتے ہیں تو فوراً اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ کسی نے بندوق چلائی۔ اس کے بعد چیخ کی آواز سنتے ہیں تو سمجھ لیتے ہیں کہ کسی کے گولی لگ گئی۔ اور باہر جا کر دیکھتے ہیں کہ جسے گولی لگی ہے وہ ہمارا دوست ہے تو گولی چلانے والے کے خلاف ہمارے دل میں آتشِ انتقام بھڑک اٹھتی ہے۔ اس تمام واقعہ میں ہمارے سمع و بصر و فؤاد کی شہادت موجود ہے لہٰذا یہ علم ہے لیکن اگر ہم نہ بندوق کی آواز سنیں، نہ کسی کی چیخ، نہ اپنے دوست کو تڑپتا دیکھیں، نہ گولی چلانے والے کو، اور یونہی کسی کی بات سن کر ایک شخص کی جان کے لاگو ہو جائیں تو ہمارا یہ فعل علم پر مبنی نہیں ہوگا کیونکہ اس میں ہمارے سمع و بصر کی شہادت موجود نہیں ہے۔ آپ نے غور کیا کہ قرآن علم کے بارے میں حواس (SENSE - PERCEPTION) کو کس قدر اہمیت دیتا ہے۔ یہ دوسری ضرب ہے جو وہ افلاطونی تصور کے خلاف لگاتا ہے اور اسے پاش پاش کر کے رکھ دیتا ہے۔ افلاطون نے کہا تھا کہ حواس کے ذریعہ حاصل کردہ علم پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ قرآن نے کہا کہ جس بات کی شہادت سمع و بصر نہ دے وہ علم پر مبنی ہی نہیں۔ لیکن صرف سمع و بصر ہی نہیں بلکہ ان کے ساتھ فؤاد بھی۔

سمع و بصر سے کام نہ لینے والے

سمع و بصر و قلب کی اسی اہمیت کے پیشِ نظر قرآن نے صاف الفاظ میں کہہ دیا کہ جو لوگ ان سے کام نہیں لیتے وہ انسانی سطح پر نہیں بلکہ حیوانی سطح پر زندگی بسر کرتے ہیں۔ اتنا ہی نہیں بلکہ وہ انہیں جہنمی قرار دیتا ہے۔ سورۂ اعراف میں ہے۔ وَ لَقَدْ ذَرَأْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيرًا مِّنَ الْجِنِّ وَ الْإِنسِ۔ جن و انس (شہری اور صحرائی آبادیوں کے) میں اکثر وہ لوگ ہیں، جو اس قسم کی زندگی بسر کرتے ہیں جو انہیں سیدھی جہنم کی طرف لے جاتی ہے۔ لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا۔ ان کی روش یہ ہے کہ وہ سینے میں دل رکھتے ہیں لیکن اس سے سمجھنے کا کام نہیں لیتے۔ وَ لَهُمْ أَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُونَ بِهَا۔ وہ آنکھیں رکھتے ہیں لیکن ان سے دیکھنے کا کام نہیں لیتے۔ وَ لَهُمْ آذَانٌ لَّا يَسْمَعُونَ بِهَا۔ وہ کان رکھتے ہیں لیکن ان سے سننے کا کام نہیں لیتے۔ أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ۔ یہ انسان نہیں، حیوان ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گم کردہ راہ۔ أُولَٰئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ۔ (۷/۱۷۹) یہ علم و حقیقت سے بے خبر ہوتے ہیں اس سے بھی واضح ہے کہ علم وہی علم ہے جس کی شہادت سمع و بصر و قلب سے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کا علم نظری مباحث (THEORETICAL PROBLEMS) کے متعلق نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ ایسے امور میں "سمع و بصر" کا کوئی واسطہ ہی نہیں ہوتا۔ سمع و بصر کا تعلق مظاہرِ فطرت کے مشاہدات اور کائناتی نظام کے مطالعہ سے ہے۔ یعنی کائنات کے ایک ایک گوشے کو غور و فکر سے دیکھنا۔ اس عظیم القدر اور محیر العقول مشینری کے ایک ایک پرزے کا مشاہدہ کرنا۔ پھر مختلف تجربات کی رو سے یہ دیکھنا کہ ان پرزوں کی ساخت میں کونسا قانون اور ان کی نقل و حرکت میں کونسی اسکیم کارفرما ہے۔ اسی کو دورِ حاضر کی اصطلاح میں علم سائنس (SCIENTIFIC KNOWLEDGE) کہتے ہیں اور اسی کو قرآن مومنین کا شعار بتاتا ہے۔ آپ دیکھئے کہ قرآن اس حقیقت کو کس قدر واضح اور حسین انداز میں بیان کرتا ہے۔ سورۂ آلِ عمران میں ہے۔ إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَ الْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَ النَّهَارِ لَآيَاتٍ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ۔ یقیناً اس کائنات کی پستیوں اور بلندیوں کی تخلیق اور رات اور دن کی گردش میں صاحبانِ عقل و شعور کے لئے بڑی بڑی نشانیاں ہیں۔ کون سے ارباب دانش کیلئے؟

خدا کا ذکر کرنے والے

اَلَّذِينَ يَذْكُرُونَ اللَّهَ قِيَامًا وَّ قُعُودًا وَّعَلَىٰ جُنُوبِهِمْ۔ ان کے لئے جو اٹھتے بیٹھتے، لیٹتے، ہر وقت قانونِ خداوندی کو اپنے سامنے رکھتے ہیں۔ وَ يَتَفَكَّرُونَ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَ الْأَرْضِ۔ یعنی تخلیقِ ارض و سماء میں غور و فکر کرتے ہیں اور اپنے مشاہدات و تجارب کے بعد علیٰ وجہ البصیرت اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هَٰذَا بَاطِلًا۔ اے ہمارے نشوونما دینے والے! تو نے کائنات کی کسی شے کو بے کار یا تخریبی نتائج کے لئے پیدا نہیں کیا۔

آپ غور کیجئے کہ یہ کتنی بڑی بات ہے جو قرآن نے کہی ہے۔ قرآن کا یہ دعوے ہے کہ کائنات کی کوئی شے

نہ عبث و بے کار ہے اور نہ محض تخریبی نتائج کے لئے وجود میں لائی گئی ہے۔ ہر شے ایک متعین مقصد رکھتی ہے اور نوعِ انسانی کے لئے کسی نہ کسی پہلو سے نفع بخش ہے۔ لیکن قرآن کا یہ مقصد نہیں کہ ہم اس کے اس دعوے کو یونہی مانتے رہیں۔ وہ کہتا ہے کہ تمہارا فریضہ ہے کہ تم کائنات کی ایک ایک چیز پر غور کرو اور مسلسل مشاہدات اور پیہم تجربات کے بعد ان کے متعلق یہ ثابت کرو کہ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا۔ آپ سوچئے! کہ یہ کتنا بڑا پروگرام ہے جو قرآن نے جماعتِ مومنین کے سامنے رکھا ہے۔ یہ کتنی عظیم ذمہ داری ہے جو ان پر عاید کی گئی ہے۔ کائنات کی ہر شے کے متعلق عملاً ثابت کرنا کہ وہ فلاں فائدہ کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ یہ ہے قرآن ماننے والوں کا فریضہ! غور کیجیئے! کہ اس کے لئے کس قدر عمیق اور وسیع سائنٹیفک تحقیقات کی ضرورت ہے۔ اس کے لئے کتنی بڑی بڑی معمل (LABORATORIES) درکار ہیں۔ اس طرح عملی تحقیقات کرنے والے ہیں وہ لوگ، جو علیٰ وجہ البصیرت پورے حتم و یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا۔ اے کائنات کے نشوونما دینے والے! تو نے کائنات کی کسی شے کو بے مقصد پیدا نہیں کیا۔ سُبْحٰنَكَ۔ تو اس سے بہت دور ہے کہ کسی شے کو محض تخریب کے لئے پیدا کر دے۔ یہ چیز تیری شانِ ربوبیت سے بہت بعید ہے۔ یہ تو ہماری کم علمی اور سائنٹیفک تحقیقات کا فقدان ہے جو ہم ان کے نفع بخش پہلوؤں سے بے خبر، فلہذا ان کی زہرپاشیوں سے جھلستے اور تڑپتے رہتے ہیں۔ ہماری آرزو یہ ہے کہ تو ہمیں ان تحقیقات کی توفیق عطا فرما۔ تاکہ ہم اس قسم کے دردناک عذاب سے محفوظ رہیں۔ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ۔ اس لئے کہ جو قومیں اس قسم کی تحقیقات (RESEACHES) سے اشیائے کائنات کے نفع بخش پہلوؤں سے بے خبر رہتی ہیں، وہ تسخیرِ فطرت نہیں کر سکتیں۔ لہٰذا دنیا میں ذلت و خواری کی زندگی بسر کرتی ہیں۔ رَبَّنَا إِنَّكَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ أَخْزَيْتَهُ۔ اور پھر ان ظالمین کا دنیا میں کوئی یار و مددگار نہیں ہوتا۔ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ أَنْصَارٍ۔ (۱۹۱/۳) — آپ نے غور کیا کہ قرآن نے اس ایک آیت میں کتنی بڑی بڑی حقیقتوں کو بیان کر دیا ہے۔ بہرحال، بات یہ ہو رہی تھی کہ قرآن کی رو سے امتِ مسلمہ اور جماعتِ مومنین کا فریضہ یہ ہے کہ وہ کائنات کی ایک ایک چیز کا مشاہدہ کریں اور پیہم تجربات سے ان کے منفعت بخش پہلوؤں کو بے نقاب کرتے جائیں۔ اسی کو قرآن نے "ذکر و فکر" سے تعبیر کیا ہے۔

کائنات میں آیات اللہ

یعنی کائناتی قوانین کو اپنے سامنے رکھنا۔ اور ان میں ہر آن غور و تدبر کرتے رہنا یہی مومنین کا شعار تھا۔ إِنَّ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ لَآيَاتٍ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ۔ (۳/۴۵) مومنین کے لئے کائنات کے ہر گوشے میں آیاتِ خداوندی بکھری پڑی ہیں۔ انہی سے انسان کو خدا کی خداوندی کا یقین حاصل ہوتا ہے۔ وَفِي خَلْقِكُمْ وَمَا يَبُثُّ مِنْ دَابَّةٍ آيَاتٌ لِّقَوْمٍ يُّوقِنُوْنَ۔ (۴/۴۵)۔ اور خود تمہاری تخلیق اور حیوانات کی افزائشِ نسل میں ان لوگوں کے لئے نشانیاں ہیں جو قانونِ خداوندی پر پورا پورا یقین

رکھتے ہیں۔ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَاءِ مِنْ رِّزْقٍ فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَتَصْرِيفِ الرِّيَاحِ آيَاتٌ لِّقَوْمٍ يَعْقِلُونَ ۔ (۴۵) اور رات اور دن کی گردش میں اور اس بارش میں جو بادلوں سے برستی ہے اور ہر جاندار کے لئے اپنے اندر نشو ونما کا سامان رکھتی ہے۔ اور جو زمین مردہ کو از سرِ نو زندگی بخشتی ہے اور ان ہواؤں میں جو مختلف موسموں میں مختلف سمتوں میں چلتی ہیں۔ ان تمام مظاہرِ فطرت میں اس قوم کے لئے نشانیاں ہیں جو عقل وفکر سے کام لیتی ہیں۔ ان حقائق کے بیان کرنے کے بعد قرآن ایک ایسی عظیم حقیقت کو سامنے لاتا ہے جس سے یک وقت حیرت و بصیرت پیدا ہو جاتی ہے۔ فرمایا۔ تِلْكَ آيَاتُ اللّٰهِ نَتْلُوهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ۔ یہ وہ آیات ہیں جنہیں ہم حق کے ساتھ تمہارے سامنے پیش کر رہے ہیں۔ فَبِأَيِّ حَدِيثٍ بَعْدَ اللّٰهِ وَآيَاتِهِ يُؤْمِنُونَ ۔ (۴۶) سو جو لوگ اللہ اور اس کی اس قسم کی آیات پر بھی ایمان نہیں لاتے تو پھر ان کے سامنے اور کون سی حقیقت ایسی آئے گی جس کی رو سے وہ خدا پر ایمان لائیں گے؟ یعنی اللہ تعالےٰ نے واضح الفاظ میں بتا دیا ہے کہ خدا پر ایمان لانے کے لئے مظاہرِ فطرت کا مشاہدہ، اور اس کے کائناتی قوانین کا مطالعہ کرو۔ اگر کسی کو ان کے ذریعے بھی خدا پر ایمان حاصل نہیں ہوتا تو پھر کوئی اور حقیقت ایسی نہیں رہ جاتی جس سے اسے ایمان نصیب ہو سکے۔ آپ نے غور کیا کہ قرآن مشاہدۂ کائنات اور مطالعۂ فطرت پر کس قدر زور دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ صحیح اور علیٰ وجہ البصیرت ایمان حاصل ہی اس سے ہوتا ہے۔ اس سے "خدا بے نقاب ہو کر سامنے آجاتا ہے":

یہ جو ہم نے کہا ہے کہ اس سے "خدا بے نقاب ہو کر سامنے آجاتا ہے" تو یہ محض شاعری نہیں۔ یہ قرآن کی آیت کا ترجمہ ہے۔ ایک آیت کا نہیں، متعدد آیات میں یہ حقیقت بیان ہوئی ہے۔

انسانی زندگی کا منتہیٰ کیا ہے؟ ایک خدا پرست انسان کی آخری آرزو کیا ہو سکتی ہے؟ احکامِ خداوندی کی پابندی سے انتہائی مقصود کیا ہے؟ ان سوالات کا ایک ہی جواب ہو سکتا ہے کہ ہر خدا پرست کی آرزو یہی ہوتی ہے کہ اسے "خدا مل جائے"۔ اس کی اپنے "رب سے ملاقات" ہو جائے۔ اب دیکھئے کہ قرآن اس کے لئے کیا طریق بتاتا ہے۔ سورۂ رعد میں ہے۔ اَللّٰهُ الَّذِي رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا ۔ اللہ کی ذات وہ ہے جس نے ایسے ایسے عظیم کروں کو فضا کی بلندیوں میں بغیر کسی ایسے ستون کے جو تمہیں نظر آئے، اس حسن وخوبی سے اٹھا رکھا ہے۔ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ ۔ اور وہ خدا اس تمام کائنات کے مرکزی کنٹرول کو اپنے ہاتھ میں رکھے ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ ۔ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ۔ كُلٌّ يَّجْرِي لِأَجَلٍ مُّسَمًّى ۔ اس نے چاند اور سورج کو اپنے قانون کی زنجیروں میں اس طرح جکڑ رکھا ہے کہ وہ مقرر کردہ راستوں پر ایک وقت معین تک کے لئے بلا چون وچرا چلے جا رہے ہیں۔ يُدَبِّرُ الْأَمْرَ

لقاءِ ربّ

وہ خدا اپنے اس پروگرام کو حسنِ تدابیر سے چلائے جا رہا ہے۔ يُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ۔ اور اپنی ان آیات کو تمہارے لئے کھول کھول کر بیان کرتا ہے۔ لَعَلَّكُمْ بِلِقَآءِ رَبِّكُمْ تُوْقِنُوْنَ۔ (۱۳/۲) تاکہ تم اپنے رب کی ملاقات کا پورا پورا یقین کر سکو۔ آپ نے دیکھا کہ قرآن نے یہاں کیا کہا ہے؟ اس نے کہا یہ ہے کہ نظامِ کائنات کے متعلق یہ تمام تفصیلات اس لئے بیان کی جاتی ہیں کہ تمہیں اس بات کا یقین آجائے کہ تم اپنے رب سے مل سکتے ہو۔ تمہارا رب تمہارے سامنے آسکتا ہے۔ اس کا مطلب صاف ہے کہ اگر تم اپنے رب کو اپنے سامنے دیکھنا چاہتے ہو تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ تم نظامِ کائنات کا مطالعہ کرو۔ ایک ایک شے پر غور و فکر کرو۔ مختلف تجربات سے اس حقیقت کا انکشاف کرو کہ یہ تمام سلسلۂ کائنات کس محکم قانون کے مطابق چل رہا ہے۔ اس طرح وہ تمام پردے ایک ایک کر کے اٹھ جائیں گے جو خدا کے نظامِ کائنات کو سطح بین نگاہوں سے چھپائے رکھتے ہیں — اور تم علیٰ وجہ البصیرت دیکھ لو گے کہ اس کا قانونِ ربّ العالمینی کس طرح کائنات کی نشو و نما کئے جا رہا ہے۔ اس طرح تم اپنے رب کو اپنے سامنے بے نقاب دیکھ لو گے۔ اس مقام پر اتنا سمجھ لینا ضروری ہے کہ جہاں تک خدا کی ذات کا تعلق ہے آنکھوں سے دیکھ لینا تو ایک طرف، اس کا تصور بھی ذہنِ انسانی میں نہیں آسکتا۔ لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ۔ (۶/۱۰۴)۔ انسانی نگاہیں اسے پا ہی نہیں سکتیں۔ اس لئے "لقاءِ رب" کے یہ معنی نہیں کہ خدا کی ذات بے نقاب ہو کر انسان کے سامنے آسکتی ہے۔ اس کے معنی یہی ہیں کہ فطرت کے مشاہدات سے خدا کا نظامِ کائنات انسان کے سامنے بے نقاب ہو کر آجاتا ہے۔ اور وہ اس کی ربّ العالمینی کی کارفرمائیوں اور کرشمہ سازیوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتا ہے۔ بہرحال یہ حقیقت واضح ہے کہ قرآن کی رو سے "لقاءِ رب" کا یقین انہی کو آسکتا ہے جو فطرت کا مشاہدہ کریں۔ لیکن اس کے لئے بڑی جد و جہد درکار ہوتی ہے۔ پیہم سعی و عمل اور مسلسل تگ و تاز کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے لئے کبھی ہمالیہ کی چوٹیوں پر چڑھنا پڑتا ہے اور کبھی بحرِ اطلانطک کی گہرائیوں میں اترنا۔ کبھی افریقہ کے تپتے ہوئے صحراؤں میں جھلسنا پڑتا ہے اور کبھی قطبِ شمالی کے برف پوش میدانوں میں ٹھٹھرنا۔ کبھی شیروں کے منہ میں ہاتھ دینا پڑتا ہے اور کبھی اپنے آپ کو سانپوں سے ڈسوانا۔ کبھی ایک پتے کی تحقیق میں مہینوں وقفِ فکر و تدبر رہنا پڑتا ہے اور کبھی ایک جرثومہ کی تشریح میں برسوں محوِ مطالعہ و مشاہدہ اور ظاہر ہے کہ یہ کچھ وہی قومیں کر سکتی ہیں جو حاضر و موجود پر مطمئن ہو کر نہ بیٹھ جائیں بلکہ مستقبل کی فکر میں غلطاں و پیچاں رہیں۔ دیکھئے! قرآن نے اس حقیقت کو کس قدر واضح الفاظ میں بیان کیا ہے۔ ارشاد ہے۔ اِنَّ فِي اخْتِلَافِ الَّيْلِ وَ النَّهَارِ وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَّقُوْنَ۔ یقیناً دن اور رات کی گردش، اور کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے، اس کی تخلیق میں تقویٰ شعار قوم کے لئے خدا کی آیات ہیں۔ اس کے بعد ہے اِنَّ الَّذِيْنَ

متقی کون ہیں؟

لَا یَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا فَاَرَضُوْا بِالْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا۔ اس کے برعکس جو لوگ "ہماری ملاقات" کی توقع نہیں رکھتے، جن کے دل میں اس کی آرزو موجزن نہیں ہوتی۔ یعنی وہ لوگ جو پیش پا افتادہ مفاد، حال کی قریبی زندگی پر راضی ہو جاتے ہیں۔ وَاطْمَاَنُّوْا بِھَا۔ اور جو کچھ سامنے پڑا ہوا اسی پر مطمئن ہو کر بیٹھ جاتے ہیں، وَالَّذِیْنَ ھُمْ عَنْ اٰیٰتِنَا غٰفِلُوْنَ۔ یعنی وہ لوگ جو ہماری ان کائناتی نشانیوں سے بے خبر رہتے ہیں۔ اُولٰٓئِکَ مَاْوٰھُمُ النَّارُ بِمَا کَانُوْا یَکْسِبُوْنَ۔ (۱۰/۷۔۸) یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے اعمال کی بدولت جہنم کے عذاب میں مبتلا رہتے ہیں۔ پہلے تو اس بات پر غور کیجئے کہ قرآن کریم نے رَضُوْا بِالْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا اور وَاطْمَاَنُّوْا بِھَا سے کتنی بڑی حقیقت کی پردہ کشائی کی ہے۔ دنیا میں قوموں کی نکبت و زبوں حالی اور عروج و اقبال کا بنیادی راز کیا ہے؟ کیا یہی نہیں کہ ایسی قومیں جو اس پر شاکر اور قانع ہو کر بیٹھ جائیں جو انہیں آسانی سے میسر آ رہا ہے وہ ندرتِ فکر اور قوتِ عمل سے محروم ہو کر ذلت و پستی کے عمیق گڑھوں میں جا گرتی ہیں اور زندہ قوموں کی صفوں سے کہیں پیچھے رہ جاتی ہیں۔ ان کے برعکس، جو قومیں حاضر و موجود پر قانع نہیں رہتیں بلکہ مسلسل محنت و مشقت سے نت نئی ایجادات اور نت نئے انکشافات کرتی رہتی ہیں۔ وہ مصافِ زندگی میں کہیں آگے نکل جاتی ہیں۔ یہ وہ قومیں ہیں جو خدا کے نظامِ کائنات کو اپنے سامنے بے نقاب دیکھنے کے نشہ میں سرشار رہتی ہیں۔ نتیجہ اس کا یہ ہوتا ہے کہ آسمان ان پر اپنی قوتوں اور برکتوں کے دروازے کھول دیتا ہے۔ زمین اپنے چھپے ہوئے خزانے ان کے حوالے کر دیتی ہے۔ جو قومیں ایسا نہیں کرتیں وہ اس سامانِ ربوبیت سے محروم رہ جاتی ہیں۔ وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا بِاٰیٰتِ اللّٰہِ وَلِقَآئِہٖٓ اُولٰٓئِکَ یَئِسُوْا مِنْ رَّحْمَتِیْ۔ جو لوگ ان آیاتِ خداوندی اور ملاقاتِ ربی سے

سامانِ ربوبیت سے محرومی

انکار کرتے ہیں وہ خدا کے عطا فرمودہ سامانِ نشوو ارتقاء سے محروم رہ جاتے ہیں۔ وَاُولٰٓئِکَ لَھُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ۔ (۲۹/۲۳) یعنی یہ لوگ ایک دردانگیز عذاب کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ آپ نے دیکھا کہ خدا کے سامانِ رحمت و ربوبیت سے محرومی کو قرآن نے عذابِ الیم کہا ہے۔ اسی کو سورۂ آلِ عمران اور سورۂ یونس میں عذابِ نار سے تعبیر کیا گیا ہے۔ (۳/۱۹۱، ۱۰/۷) یہ آیات پہلے لکھی جا چکی ہیں۔) ذرا سوچئے کہ حجاز کے بے برگ و گیاہ صحرا کے نیچے ذہبِ سیال (LIQUID GOLD) یعنی پٹرول کے دریا صدیوں سے بہہ رہے تھے۔ لیکن چونکہ اہلِ عرب حاضر و موجود پر مطمئن تھے اس لئے وہ اس بیش بہا نعمتِ خداوندی کی نفع بخشیوں سے محروم تھے۔ نتیجہ اس کا یہ تھا کہ وہ لوگ نانِ شبینہ تک کے لئے دوسروں کی خیرات کے محتاج تھے۔ یہ خدا کا بہت بڑا عذاب تھا۔ [قرآن نے بھوک کو خدا کا عذاب کہا ہے۔ (فَاَذَاقَھَا اللّٰہُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ۔ (۱۶/۱۱۲)] اب اقوامِ مغرب کی نگہِ خلاشگاف نے "پگھلے ہوئے سونے" کے ان دریاؤں کا سراغ پا لیا۔ اور اپنی مسلسل

کوہ کنی سے انہیں کھینچ کر باہر لے آئے۔ اس سے حجاز کا نقشہ بدل گیا۔ خود ہمارے خطۂ زمین (پاکستان) میں فطرت نے ممکنات (POTENTIAL I TIES) کی ایک دنیا چھپا رکھی ہے لیکن ہم چونکہ حاضر و موجود پر مطمئن ہیں۔ اور میسرہ (جو کچھ محنت کے بغیر حاصل ہو جائے) پر شاکر و قانع، اس لئے روٹی تک کے لئے بھی دوسروں کے محتاج ہیں۔ یورپ کی بعض قوموں کے پاس چپہ چپہ بھر زمین ہے لیکن وہ اسی زمین سے اتنا کچھ پیدا کر لیتے ہیں کہ اپنی ضروریات پورا کرنے کے بعد دوسرے ملکوں کو بھی سامانِ زیست بھیجتے ہیں اس لئے کہ وہ فطرت کے مخفی خزانوں کو بے نقاب دیکھنے کے لئے معروفِ سعی و عمل رہتے ہیں۔ ہم نے اس قانونِ خداوندی سے صدیوں سے اعراض برت رکھا ہے۔ اس لئے ہم پر معیشت تنگ ہو رہی ہے وَمَنْ أَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِي فَإِنَّ لَهُ مَعِيشَةً ضَنْكًا۔ (۲۰/۱۲۹) خدا کا کھلا ہوا فیصلہ ہے جو کسی کی خاطر بدل نہیں سکتا۔ حتیٰ کہ مدت دراز سے اپنے سمع و بصر سے کام نہ لینے کا نتیجہ یہ ہے کہ ہماری یہ صلاحیتیں ہی سلب ہو چکی ہیں اور ہمارا شمار ان لوگوں میں ہو چکا ہے جن کے متعلق ارشاد ہے کہ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ طَبَعَ اللَّهُ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ وَسَمْعِهِمْ وَأَبْصَارِهِمْ ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ۔ (۱۶/۱۰۸) یہ وہ لوگ ہیں جن کے قلوب اور سمع و بصر پر مہریں لگ چکی ہیں۔ یہ لوگ ہماری آیات سے بالکل بے خبر ہیں۔

آپ نے دیکھا کہ قرآن کس طرح مختلف انداز سے اس حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ

(۱) علم وہی علم ہے جس میں انسان اپنے حواس سے پورا پورا کام لے۔

(۲) حواس سے کام لینے سے مفہوم یہ ہے کہ انسان اس محسوس کائنات کے اسرار و غوامض سے پردہ کشائی کرے، اشیائے فطرت کا وسیع مشاہدہ کرے، قوانینِ فطرت کا گہرا مطالعہ کرے اور مسلسل تجربات اور پیہم تگ و تاز سے خدا کے نظام و قوانینِ ربوبیت کو اپنے سامنے بے نقاب دیکھتا چلا جائے۔

(۳) قومِ مومنین کا یہی شعار ہے۔ گروہِ متقین کا یہی فریضہ ہے۔ یہی خدا کا ذکر ہے۔ اس فکر سے چھپی ہوئی حقیقتیں ابھر کر سامنے آجاتی ہیں۔ اور انسان کائنات کی ایک ایک شے کے متعلق علی وجہ البصیرت کہہ سکتا ہے کہ۔ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هَٰذَا بَاطِلًا۔

قرآنی صداقت کی شہادت

اتنا ہی نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ نے بتا دیا ہے کہ خود قرآن کی صداقت کی شہادت بھی اپنی کائناتی آیات سے ملتی ہے۔ سورہ حٰم سجدہ میں ہے۔

سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ۔ ہم انہیں اپنی آیات، عالمِ آفاق اور عالمِ نفس میں دکھائیں گے تا آنکہ یہ بات ان کے سامنے ابھر کر آجائے کہ قرآن فی الواقع ایک حقیقتِ ثابتہ ہے۔ یعنی زمانے کے پیچ و خم میں لپٹے ہوئے حقائق جوں جوں انسانی علم و کاوش کے ہاتھوں کھلتے

جائیں گے۔ قرآن کے دعاوی کے ثبوت ایک ایک کر کے سامنے آتے جائیں گے۔ جوں جوں زمانہ مشاہداتِ فطرت اور علوم سائنس میں آگے بڑھتا جائے گا، قرآنی حقائق بے نقاب ہوتے چلے جائیں گے۔ اس آیت میں قرآن نے خارجی کائنات (آفاق) کے ساتھ خود انسانی دنیا (نفس) کو شامل کر کے اس حقیقت کو بھی واضح کر دیا ہے کہ سائنس کا تعلق صرف طبیعات (PHYSICS) ہی سے نہیں بلکہ انسانی زندگی سے متعلق جس قدر علوم ہیں، وہ بھی اس کے دائرے کے اندر آجاتے ہیں لیکن ان علوم کے متعلق محض نظری بحثیں مطلوب نہیں بلکہ ان کی تحقیق بھی عملی مشاہدات اور تجارب کی رُو سے کی جائے گی تاریخ عمرانیات (SOCIALOGY) اور عملی سائیکلوجی کو اس باب میں خاص اہمیت حاصل ہوگی۔ طبعی سائنس اور انسانی زندگی سے متعلق علوم کی رو سے جوں جوں حقائق بے نقاب ہوتے جائیں گے، قرآن کی پیش کردہ صداقتوں کی دلیلیں سامنے آتی جائیں گی۔ یہ اس لئے کہ اَوَلَمْ یَکْفِ بِرَبِّکَ اَنَّہٗ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ شَہِیْدٌ۔ قرآن اس خدا کی کتاب ہے جس کی نگاہوں سے کوئی راز مستور نہیں اس کے سامنے کائنات کی ہر شے بے نقاب رکھی ہے۔ وہ ہر وقت ہر شے کا مشاہدہ کرتا رہتا ہے۔ اور یہ اس امر کی کافی دلیل ہے کہ وہ ان اشیاء کے متعلق جو کچھ کہے گا، ٹھیک ٹھیک کہے گا۔ اس کا بیان علم و حقیقت پر مبنی ہوگا، ظن و قیاس پر نہیں اس لئے کہ اَنْزَلَہُ الَّذِیْ یَعْلَمُ السِّرَّ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ۔ (۲۵:۶) قرآن اس خدا کی طرف سے نازل ہوا ہے جو کائنات کے تمام رموز و اسرار سے واقف ہے۔ لیکن جو لوگ کائنات کی ان آیات سے بے خبر رہتے ہیں، انہیں درحقیقت "لقاء رب" کا یقین نہیں ہوتا۔ اَلَآ اِنَّھُمْ فِیْ مِرْیَۃٍ مِّنْ لِّقَآءِ رَبِّھِمْ۔ حالانکہ انہیں اس کے لئے کہیں دور جانے کی ضرورت نہیں۔ وہ کسی شے کی بھی ریسرچ شروع کر دیں تو انہیں خدا کا قانونِ ربوبیت جھلمل جھلمل کرتا نظر آجائے۔ اس لئے کہ اَلَآ اِنَّہٗ بِکُلِّ شَیْءٍ مُّحِیْطٌ۔ (۴۱:۵۴) خدا کا قانونِ ربوبیت ہر شے کو محیط ہے۔ کسی ایک چیز کے ساتھ ہی وابستہ نہیں۔ اس لئے ؎

چشم کو چاہیئے ہر رنگ میں وا ہو جانا

..یہاں تک ہم نے دیکھ لیا کہ قرآن کی رُو سے علم کی تعریف کیا ہے۔ اس کے بعد اس نقطے کی وضاحت

عُلماء کون ہیں؟

کی ضرورت ہی نہیں رہتی کہ قرآن کی رُو سے عالِم کسے کہتے ہیں اور علماء سے مراد کون لوگ ہیں لیکن قرآن کریم کا اعجاز دیکھئے کہ اس نے اس حقیقت کو بھی خود ہی واضح کر دیا ہے تاکہ اس باب میں کسی قسم کا شبہ یا ابہام نہ رہے۔ قرآن میں "علماء" کا لفظ صرف دو مقامات پر آیا ہے۔ ایک جگہ سورۂ شعراء میں (۲۶:۱۹۷) جہاں علمائے بنی اسرائیل کا ذکر ہے۔ دوسری جگہ سورۂ فاطر میں جہاں "خدا کے بندوں میں سے علماء" کا ذکر ہے۔ اس تذکرہ کی ابتداء اس طرح ہوتی ہے۔ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰہَ

اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجْنَا بِهٖ ثَمَرٰتٍ مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُهَا ۔ کیا تو نے اس پر غور نہیں کیا کہ اللہ کا قانون کس طرح بادلوں سے مینہ برساتا ہے اور اس سے انواع و اقسام کے پھل پیدا ہوتے ہیں۔ وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌ بِیْضٌ وَّحُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهَا وَغَرَابِیْبُ سُوْدٌ ۔ اور پہاڑوں میں کس کس انداز کے سرخ، سفید طبقے ہیں جن کے رنگ اور اقسام مختلف ہیں اور ان میں بعض گہرے سیاہ رنگ کے ہیں۔ وَمِنَ النَّاسِ وَ الدَّوَآبِّ وَ الْاَنْعَامِ مُخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ كَذٰلِكَ ۔ اور اسی طرح انسانوں اور دیگر جانداروں، مویشیوں کے بھی مختلف اقسام ہیں۔ آپ نے دیکھا کہ ان آیات میں کن امور کا ذکر ہو رہا ہے۔ کائنات کے مختلف گوشوں کا، بساطِ فطرت کے متنوع شعبوں کا، سائنس کے مختلف علوم کا۔ طبیعات (PHYSICS) نباتیات (BOTANY) طبقات الارض (GEOLOGY) حیوانیات (ZOOLOGY) اور انسانیات کے تمام شعبے اس کے اندر آجاتے ہیں۔ ان علوم و فنون کے تذکرہ کے بعد ہے۔ اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا ۔ حقیقت یہ ہے کہ خدا کے بندوں میں سے علماء ہی وہ ہیں جن کے دل پر اس کی عظمت اور ہیبت چھا جاتی ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ غَفُوْرٌ ۔ (۳۵/۲۷-۲۸) کیونکہ وہ علیٰ وجہ البصیرت اس حقیقت کا مشاہدہ کر لیتے ہیں کہ خدا کتنی بڑی قوتوں کا مالک ہے۔ اور کس طرح اپنے عظیم کارگہ کائنات کو ہر قسم کی تخریب سے محفوظ رکھ کر آگے بڑھائے جا رہا ہے۔ آپ نے غور کیا کہ قرآن نے علماء کا لفظ کن لوگوں کے لئے استعمال کیا ہے؟ انہی کے لئے جنہیں ہم آج کی اصطلاح میں سائنٹسٹ اور کائناتی مفکر کہتے ہیں۔ وہ لوگ جو کائناتی نظام کا مطالعہ کرتے اور مسلسل مشاہدات و تجربات کے بعد فطرت کی قوتوں کو مسخر کرتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ خدا نے فطرت کی تمام قوتیں ہمارے لئے مسخر کر رکھی ہیں۔ (وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ) لیکن ان قوتوں کو اپنے کنٹرول میں وہی لا سکتا ہے جو ان قوانین سے واقف ہو، جن کے مطابق یہ قوتیں کام کرتی ہیں۔ یہ قوانین، فطرت کے مشاہدہ اور مطالعہ اور پیہم تجربات سے معلوم ہو سکتے ہیں۔ جو لوگ ان قوانین کا علم حاصل کرتے ہیں، انہیں قرآن علماء کہہ کر پکارتا ہے۔

ہمارے علماء

علماء کی اس قرآنی تعریف (DEFINITION) کے بعد آپ غور کیجئے کہ ہمارے ہاں جو حضرات علماء کہلاتے ہیں، انہیں علم الفطرت (سائنس کے علوم) سے کس قدر تعلق ہوتا ہے؟ وہ علم الفطرت کے مبادیات تک سے واقف نہیں ہوتے۔ ان کا علم نظری مباحث، اور لفظی کٹ حجتوں سے ایک قدم آگے نہیں جاتا۔ اور یہ نظری مباحث بھی ان مسائل سے متعلق ہوتے ہیں جنہیں نہ کائنات سے کچھ تعلق ہوتا ہے، نہ انسان کی عملی زندگی سے کچھ واسطہ۔ ہمارے مذہبی مدارس کا نصاب قریب دس سال پر پھیلا ہوا ہوتا ہے۔ اس دس سال میں سے بیشتر عرصہ منطق، فلسفہ، معانی، بیان، ادب، نحو وغیرہ کی تحصیل میں صرف ہو جاتا ہے۔ اور منطق و فلسفہ بھی وہ جواب

عہدِ پارینہ کی داستان بن چکا ہے ۔اس نصاب میں ہیئت ، ہندسہ اور حساب کی بھی دو تین کتابیں ہوتی ہیں ۔ لیکن ان میں بھی وہ کچھ پڑھایا جاتا ہے جو زندگی میں کسی کام نہیں آتا ۔اور آپ حیران ہونگے کہ ان کے نصاب میں قرآن کریم بھی داخل نہیں ، تفسیر میں جلالین پڑھا دی جاتی ہے جس میں صرف قرآنی الفاظ کے مرادفات دیئے گئے ہیں اور آخری سال سورۂ بقرہ کی تفسیر بیضاوی ۔بس یہ ہے ان کا نصاب جس کی تکمیل کے بعد انہیں عالم ہونے کی سند مل جاتی ہے ۔اشیائے فطرت کے متعلق ان حضرات کے علم کا اندازہ اس سے لگایئے کہ جب ہندوستان میں لاؤڈ اسپیکر کا استعمال شروع ہوا ہے تو "علمائے کرام" سے اس کے جائز اور ناجائز ہونے کے متعلق فتویٰ مانگا گیا ۔اس فتویٰ کے جواب میں جمعیۃ العلماء کے صدر مفتی کفایت اللہ مرحوم نے لکھا کہ

> جس آلہ کے متعلق سوال کیا گیا وہ اب تک دیکھنے میں نہیں آیا ۔مگر سننے میں آیا ہے کہ وہ ایک ایسا آلہ ہے جسے خطیب یا قاری کے سامنے رکھ دیا جاتا ہے اور وہ اس کی طرف رخ کئے ہوئے قرأت یا خطاب کرتا ہے ۔بس وہ آلہ آواز کو جذب کر کے اتنی دور نشر کرتا ہے کہ اس کے چوتھائی فاصلہ تک بھی بغیر اس کی مدد کے آواز پہنچانا مشکل ہے ۔　　(بحوالہ نقیب ۱/۱۰)

اسکے بعد مفتی صاحب نے اس کے جواز کا فتویٰ دے دیا ۔لیکن مفتی محمد شفیع صاحب نے (جو اس زمانے میں دارالعلوم دیوبند کے مفتی تھے اور اب پاکستان میں ہیں) اس کے خلاف ان فتوؤں کا مجموعہ شائع کیا جن میں "عبادات مقصودہ" کے لئے اس آلہ کو حرام قرار دیا گیا تھا[1] ۔انہوں نے اس رسالہ میں (جس کا نام البدائع المفیدہ فی حکم الصنائع الجدیدہ تھا) لکھا تھا کہ انہیں معلوم نہیں تھا کہ اس آلہ کی ماہیت کیا ہے اور وہ کس طرح کام کرتا ہے ۔اس کیلئے انہوں نے الیگزنڈرا ہائی اسکول بھوپال کے سائنس ماسٹر برج نندن لال صاحب سے دریافت فرمایا ۔انہوں نے کہا کہ

> برقی قوت کی وجہ سے میں تو کم از کم یہ ماننے میں تامل کرتا ہوں کہ اصل آواز ہے اور اس کا انکار بھی مجھ سے ممکن نہیں کہ ثبوت مشکل ہے ۔

چنانچہ اس تحقیقِ انیق کے بعد مفتی صاحب نے عبادات کے لئے لاؤڈ اسپیکر کے استعمال کو حرام قرار دے دیا یعنی ماسٹر برج نندن صاحب کی بات کی بنیاد پر یہ فیصلہ فرمایا کہ خدا اور رسول کا اس باب میں یہ حکم ہے ۔آپ نے غور کیا کہ اشیائے فطرت کی تحقیقات اور علوم جدیدہ کے متعلق ان حضرات کی معلومات کی کیا کیفیت ہوتی ہے ۔ان چیزوں کے متعلق ان کی معلومات کا تو یہ عالم ہوتا ہے لیکن یہ ان کے حلال و حرام ہونے کے متعلق فتوے صادر کرتے رہتے ہیں ۔اور اب پاکستان میں معاملہ فتاویٰ کی حد سے بڑھ کر قانون سازی تک پہنچ گیا ہے ۔مثلاً اگر اب یہ

---

[1] اب یہی علمائے کرام لاؤڈ اسپیکر کو نماز اور خطبات میں بلا تکلف استعمال کرتے ہیں ۔

معاملہ حکومت کے سامنے آجائے کہ خطبات کے لئے لاؤڈ اسپیکر کا استعمال جائز ہے یا ناجائز۔ اور اس کے لئے کسی قانون کے وضع کرنے کی ضرورت ہو تو یہ قانون علمائے کرام مرتب کریں گے۔ یعنی یہ حضرات پہلے (کسی) ماسٹر برج نندن لال صاحب سے دریافت کریں گے کہ لاؤڈ اسپیکر ہوتا کیا ہے۔ اور اس کی بہم پہنچائی ہوئی معلومات کی بنا پر اس بات کا فیصلہ کریں گے کہ اس کا استعمال از روئے کتاب وسنت جائز ہے یا ناجائز اور یہ فیصلہ مملکت کے قانون کی حیثیت سے نافذ ہو گا۔

یہ حضرات سب سے زیادہ زور اس بات پر دیتے ہیں کہ اگر ہم نہ ہوں تو لوگوں کو شریعت کے مسائل کون بتائے۔ سو معلوم ہونا چاہیئے کہ اسلامی مملکت میں شریعت کے مسائل اس مملکت کے قوانین کے الگ کچھ نہیں ہوتے۔ لہٰذا ان کے بتانے کے لئے کسی خاص گروہ کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔ یہ کام حکومت کے عمال کا ہوتا ہے نہ کہ مولویوں کے گروہ کا۔ جب رسول اللہؐ اور خلفائے راشدینؓ کے زمانہ میں اسلامی مملکت قائم تھی تو اس وقت مولویوں کی کوئی جماعت نہ تھی۔ یہ سب بعد کے زمانہ کی پیداوار ہیں۔

باقی رہے ایسے معاشرتی احکام جو روزمرہ کی زندگی میں پیش آتے ہیں۔ مثلاً نکاح کیسے پڑھانا چاہیئے جنازہ کی نماز کس طرح ہوتی ہے تو ان تمام امور کا جاننا ہر مسلمان کے لئے ضروری ہے۔ یہ ایسی باتیں نہیں جن کے لئے کسی دارالعلوم میں جانا پڑے۔

ان تصریحات سے آپ نے دیکھ لیا ہو گا کہ قرآن کریم کی رو سے مومنین، متقین، خدا کا ذکر کرنے والے، "لقاء رب" کی آرزو اور یقین رکھنے والے وہی ہیں جو کائناتی نظام پر غور و فکر کرتے اور اشیائے فطرت کی تحقیقات (ریسرچ) کے لئے عملی جدوجہد کرتے ہیں۔ اسی کا نام قرآن کی رو سے علم ہے اور اسی علم کے حاملین کو وہ علماء قرار دیتا ہے۔

ایک شبہ کا ازالہ

اس مقام پر آپ کے دل میں شاید خیال پیدا ہو کہ اس بناء پر تو یورپ کی قومیں صحیح معنوں میں مومن اور متقی ہیں۔ لیکن یہ خیال صحیح نہیں۔ جماعتِ مومنین، اور گروہِ متقین کے لئے علم الفطرت کی تحصیل نہایت ضروری ہے۔ لیکن یہ سمجھنا غلط ہے کہ ہر وہ قوم جو علم الفطرت حاصل کر لے، مومن اور متقی ہو جاتی ہے۔ یہ فرق اہم ہونے کے ساتھ ذرا باریک بھی ہے۔ اس لئے اسے غور سے سمجھنے کی ضرورت ہے۔ مومن و متقی وہ ہیں جو تسخیر فطرت کے بعد، فطرت کی قوتوں کو ان قوانین خداوندی کے مطابق صرف کرتے ہیں جو قرآن میں دیئے گئے ہیں۔ مومن اور متقی ہونے کے لئے یہ دونوں شرطیں ناگزیر ہیں۔ یعنی — (۱) تسخیر فطرت، اور (۲) اس کے ماحصل کو قوانین خداوندی کے مطابق صرف کرنا۔ اگر کسی

قوم میں ان دو شرطوں میں سے کسی ایک شرط کی بھی کمی ہے تو وہ قوم مومن اور متقی نہیں ہو سکتی۔ قرآن اُدْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَآفَّۃً۔ (۲/۲۰۸) کا حکم دیتا ہے۔ یعنی قرآن کے پورے کے پورے نظام کو اپنے اوپر وارد کرنے کا حکم ہم صحیح معنوں میں مومن اور متقی نہیں کیونکہ ہم میں شرطِ اول (تسخیرِ فطرت) کی کمی ہے (اور جب ہم شرطِ اول تسخیرِ فطرت ہی پوری نہیں کرتے تو شرطِ دوم، قوائے فطرت کا قوانینِ خداوندی کے مطابق صرف کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا) اور اقوامِ مغرب مومن اور متقی نہیں کیونکہ ان میں شرطِ دوم کی کمی ہے۔ لہٰذا ایمان و تقویٰ کی سطح پر وہ اور ہم دونوں یکساں ہیں۔ لیکن وہ قومیں اس اعتبار سے ہم سے آگے ہیں کہ انہوں نے تسخیرِ فطرت سے اپنی طبعی زندگی کو خوشگوار بنا لیا ہے اور ہم روٹی تک کے لئے ان کے محتاج ہیں۔

قوائے فطرت کو قوانینِ خداوندی کے مطابق صرف کرنے کے لئے قرآن کے علم کی ضرورت ہے کیونکہ یہ قوانینِ خداوندی قرآن کے اندر ہیں۔ یہی وہ الراسخون فی العلم (۳/۷) ہیں جو قرآن پر علیٰ وجہ البصیرت ایمان رکھتے ہیں اور تمام امور کے فیصلے اسی کے مطابق کرتے ہیں کہ مَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْکٰفِرُوْنَ۔ (۵/۴۴) جو کتاب اللہ کے مطابق فیصلے نہیں کرتے وہ مومن نہیں کافر ہیں۔ اس کفر کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسانی معاشرہ دولت اور رزق کی فراوانی کے باوجود جہنم بن جاتا ہے (جیسا کہ اس وقت یورپ کا حال ہو رہا ہے) وہ لوگ سائنس کا اس قدر وسیع علم رکھنے کے باوجود، انسانی زندگی کے معاملات کا صحیح حل دریافت نہیں کر پاتے۔ یعنی اس باب میں ان کا سمع و بصر و فواد انہیں کچھ کام نہیں دے رہا۔ قرآن کریم نے ایسی ہی قوموں کے متعلق کہا ہے کہ وَلَقَدْ مَکَّنّٰھُمْ فِیْمَآ اِنْ مَّکَّنّٰکُمْ فِیْہِ وَجَعَلْنَا لَھُمْ سَمْعًا وَّ اَبْصَارًا وَّ اَفْئِدَۃً۔ ہم نے ان قوموں کو دنیا میں اس قدر تمکن عطا کیا تھا کہ تمہیں بھی ایسا تمکن نہیں عطا کیا۔ اس کے ساتھ ہی انہیں سمع و بصر و فواد بھی عطا کیا تھا۔ لیکن فَمَآ اَغْنٰی عَنْھُمْ سَمْعُھُمْ وَلَآ اَبْصَارُھُمْ وَلَآ اَفْئِدَتُھُمْ مِّنْ شَیْءٍ اِذْ کَانُوْا یَجْحَدُوْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰہِ۔ (۴۶/۲۶) لیکن جب انہوں نے ان قوانینِ خداوندی کی صداقت سے انکار کیا جو رسولوں کی وساطت سے انہیں ملے تھے تو ان کی سمع و بصر و فواد انہیں تباہی سے نہ بچا سکے۔ یہ تمام علم ان کے کسی کام نہ آ سکا۔ اگر یہ لوگ کائنات کی قوتوں اور فطرت کی بخششوں کو قوانینِ خداوندی کے مطابق صرف کریں تو وہ جہنم جس میں دنیا اس وقت مبتلا ہے اس جنت میں تبدیل ہو جائے جس کی تلاش میں انسانیت ماری ماری پھر رہی ہے۔ آپ سورۂ یونس کی ان آیات کو پھر اپنے سامنے لائیے جن میں کہا گیا ہے کہ جو لوگ کائنات میں غور و فکر سے خدا کے نظامِ ربوبیت کو اپنے سامنے بے نقاب نہیں دیکھنا چاہتے اور جو کچھ انہیں یونہی میسر آ جاتا ہے، اس پر مطمئن ہو کر بیٹھ جاتے ہیں، اُولٰٓئِکَ مَاْوٰھُمُ النَّارُ (۱۰/۸) یہ لوگ جہنم میں رہتے ہیں۔ اس کے بعد ہے اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جو لوگ ان کے برعکس آیاتِ خداوندی پر یقین رکھتے ہیں اور

اس کے بتائے ہوئے صلاحیت بخش پروگرام پر عمل پیرا ہوتے ہیں۔ یَھْدِیْھِمْ رَبُّھُمْ بِاِیْمَانِھِمْ۔ ان کا نشو و نما دینے والا ان کے اس ایمان کی بنا پر زندگی کے صحیح نقشوں کی طرف ان کی راہ نمائی کر دیتا ہے تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھِمُ الْاَنْھٰرُ فِیْ جَنّٰتِ النَّعِیْمِ۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ خوشگواریوں کے ان باغات میں رہتے ہیں جن کی شادابیوں میں کبھی فرق نہیں آتا۔ دَعْوٰھُمْ فِیْھَا سُبْحٰنَکَ اللّٰھُمَّ۔ اس جنتی معاشرہ کو دیکھ کر ان کے لب پر بے ساختہ یہ پکار آجاتی ہے کہ بار الہا! فی الواقعہ یہ بات تجھ سے بہت بعید تھی کہ تو اس کائنات کو باطل پیدا کر دیتا۔ وَتَحِیَّتُھُمْ فِیْھَا سَلٰمٌ۔ اور اس معاشرہ میں ان کی ایک دوسرے کے متعلق آرزوئیں بڑی ہی حیات بخش اور سلامتی افروز ہوتی ہیں۔ جو لوگ اس معاشرہ کو قائم کرینگے وہ مسلسل جدوجہد اور پیہم سعی و عمل سے اس کی حدود کو وسیع سے وسیع تر کرتے جائیں گے تاآنکہ آخر الامر یہ تمام نوعِ انسانی کو محیط ہو جائے گا اور دیکھنے والا پکار اٹھے گا کہ خدا کا یہ نظامِ ربوبیت کس طرح ہر قسم کی حمد و ستائش کا سزاوار ہے۔ وَاٰخِرُ دَعْوٰھُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔ (۱۰/۹)۔ یہ نتیجہ ہوتا ہے فطرت کی نعمتوں کو خدا کے قانون کے مطابق صرف اور تقسیم کرنے کا۔

حرفِ آخر

ان تصریحات سے واضح ہے کہ یہ لوگ جو اپنے آپ کو "علماء" کہتے ہیں، قرآن کریم کی رُو سے نہ ان کا علم، علم ہے اور نہ ہی انہیں عالم کہلانے کا کوئی حق پہنچتا ہے۔ ان کا علم ان میں ایک وقت کی روٹی کمانے کی بھی صلاحیت پیدا نہیں کرتا اس لئے یہ بیکاروں اور ناکاروں کا گروہ، ملت کے سینے پر مفت کا بوجھ بن کر بیٹھا رہتا ہے اور چونکہ انہیں کام کچھ کرنا نہیں پڑتا اس لئے یہ بیکار بیٹھے قوم میں انتشار پیدا کرنے کی سوچتے رہتے ہیں ـــ کارِ مُلّا فی سبیل اللہ فساد ـــ (اقبالؒ)

قرآنِ کریم کی رُو سے علم سے مقصد یہ ہے کہ نظامِ کائنات اور کاروبارِ حیات کے متعلق عملی تحقیق کی جائے اور ان شعبوں میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کر کے فطرت کی قوتوں کو مسخر کیا جائے۔ اور اس کے ساتھ، قرآنِ کریم کے مطالعہ سے یہ دیکھا جائے کہ ان قوتوں کو کس مصرف میں لایا جائے۔ بس یہی علم۔ اور اس کے حاصل کرنے والے وہ ہیں جنہیں علماء کہا جا سکے گا۔ یہی ہیں وہ خطوط جن پر ہمارے اسکولوں اور کالجوں کی تعلیم از سرِ نو متشکل ہونی چاہیئے۔ ہمیں ان کالجوں اور یونیورسٹیوں سے اس قسم کے علماء پیدا کرنے چاہیئے۔ جب تک ہم یہ نہیں کرینگے نہ ان خود ساختہ "علماء" کی اکاس بیل شجرِ ملت سے الگ ہوگی اور نہ ہی یہ درخت سرسبز و شاداب ہوگا۔

پاکستان کا مستقبل اس قسم کے جدید علماء پیدا کرنے کے ساتھ وابستہ ہے۔ یعنی وہ لوگ جو علومِ حیات اور حکمتِ قرآنی کے عالم ہوں جنہیں دنیا سائنٹسٹ اور اسکالرز کہے اور قرآن انہیں مومن کہہ کر پکارے۔

یہ زمیں کس کی ہے؟

پچھلے دنوں جو غذائی صورت حالات پیدا ہوئی، وہ ہر قلبِ حساس اور ہر خواہِ ملک و ملت کو دعوتِ صد فکر و تدبر دیتی ہے۔ اسی قسم کا خطرہ (اگرچہ وہ شدت میں اس سے کم ہوتا تھا) اس سے پہلے بھی سامنے آتا رہا ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں ہم نے اگست ۱۹۵۷ء کے طلوعِ اسلام میں ایک معلومات افزا مقالہ شائع کیا تھا جس کا عنوان تھا ــــ 'یہ زمیں کس کی ہے؟' ــــ ہم سمجھتے ہیں کہ اگرچہ وہ مقالہ آج سے نو سال پہلے شائع کیا گیا تھا اور اس میں درج شدہ اعداد و شمار بھی اُسی زمانہ سے متعلق تھے، لیکن اصولی طور پر مسئلہ اِس وقت بھی وہی درپیش ہے اور اس کا حل بھی وہی جو ہم نے اُس وقت تجویز کیا تھا۔ اندریں حالات ہم نے ضروری سمجھا ہے کہ اس مقالہ کے متعلقہ حصہ کو از سرِ نو قارئین کے سامنے لاکر، آخر میں وہ تجاویز پیش کی جائیں جو ہماری قرآنی بصیرت کے مطابق، اس نازک ترین مسئلہ کا مؤثر حل ہو سکتی ہیں۔ پہلے آپ اس مقالہ کا متعلقہ حصہ ملاحظہ فرمائیے:-

یہ زمیں کس کی ہے؟

رزقِ خود را از زمیں بُردن رواست
ایں متاعِ بندہ و مِلکِ خداست

ہمارے ایک اچھے سمجھدار دوست اگلے دنوں کہہ رہے تھے کہ اس دس سال کے عرصہ میں ہمارے ملک نے بڑی نمایاں ترقی کی ہے جب ان سے اس اجمال کی تفصیل پوچھی گئی تو انہوں نے کہا کہ پاکستان کے بجٹ میں درج شدہ اعداد و شمار کی رُو سے، ۴۹-۱۹۴۸ء میں ملک کی کل آمدنی قریب چھیاسٹھ کروڑ تھی اور ۱۹۵۶-۵۷ء

میں میزان آمدنی قریب ایک ارب انتالیس کروڑ ہے۔ یعنی اس دس سال میں ملک کی آمدنی دگنے سے بھی زیادہ ہوگئی ہے۔ یہ کیا کم ترقی ہے؟

ہم نے انھیں سمجھانے کی کوشش کی کہ جس آمدنی کو وہ "ملک کی آمدنی" سمجھ رہے ہیں وہ درحقیقت حکومت کی آمدنی ہے۔ اور ملکوں کی ترقی یا تنزل کا اندازہ "ملک کی آمدنی" سے لگایا جاتا ہے نہ کہ حکومت کی ..... آمدنی سے اگرچہ وہ اس وقت تو خاموش سے ہوگئے لیکن ہمارا خیال ہے کہ وہ اچھی طرح سمجھ نہیں سکے کہ ملک کی آمدنی اور حکومت کی آمدنی میں فرق کیا ہوتا ہے؟ یہی احساس ان سطور کے لکھنے کا محرک ہوا ہے۔ اس لئے کہ ہمارا خیال ہے کہ (ہمارے اس دوست کی طرح) بہت سے احباب اس غلط فہمی میں مبتلا ہوں گے کہ چونکہ ہر سال بجٹ میں ہماری آمدنی کی میزان میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے اس لئے ہمارا ملک اقتصادی طور پر کافی ترقی کئے جا رہا ہے۔ اس غلط فہمی کے ازالہ کے لئے ضروری ہے کہ اصل حقیقت سے واقف ہوا جائے۔

ہمارے سالِ رواں کے بجٹ میں قریب ایک ارب انتالیس کروڑ کی آمدنی دکھائی گئی ہے۔ ذرا غور کیجئے کہ وہ موٹی موٹی مدات (PRINCIPAL HEADS) کیا ہیں جن پر یہ آمدنی مشتمل ہے۔

کسٹم (بحری چونگی)	قریب چوالیس کروڑ
اکسائز ڈیوٹی (آب کاری کی چونگی)	قریب چودہ کروڑ
انکم ٹیکس اور کارپوریشن ٹیکس ..	قریب اکیس کروڑ
سیلز ٹیکس	قریب چودہ کروڑ
نمک اور متفرق ٹیکس	قریب چار کروڑ
نئی تجاویز کے مطابق ٹیکس	قریب آٹھ کروڑ

یعنی ایک ارب پانچ کروڑ کے قریب یہی ہو گئے۔ باقی کچھ ریلوے کی اور کچھ ڈاک خانہ وغیرہ کی آمدنی ہے۔ ان چھوٹی چھوٹی مدات سے قطع نظر، ان بڑی بڑی مدات پر غور کیجئے اور دیکھئے کہ ان میں "ملک کی آمدنی" کس قدر ہے مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ ایک تاجر ولایت سے کوئی چیز منگاتا ہے جس کی قیمت (بندرگاہ پر پہنچکر) سو روپے بیٹھتی ہے۔ اس پر حکومت پچاس روپے کسٹم ڈیوٹی وصول کرتی ہے۔ لہٰذا ساحل پر پہنچ کر اس کی قیمت ڈیڑھ سو روپے ہو گئی۔ اس ڈیڑھ سو روپے پر (یوں سمجھئے کہ) بیس روپے سیلز ٹیکس ہے۔ یہ ہوئے ایک سو ستر تیس روپے دکاندار کا منافع سمجھ لیجئے۔ لہٰذا خریدار کو اس کے دو سو روپے دینے پڑے۔ دکاندار کے اس منافع سے حکومت نے دس روپے انکم ٹیکس وصول کیا۔

آپ نے غور کیا کہ اس لین دین میں ہوا کیا؟ حکومت نے قریب اسی روپے ملک کے اندر بسنے والے (اپنے)

لوگوں سے وصول کرتے۔ یہی وہ رقوم ہیں جن کی میزان کو بجٹ میں پاکستان کی آمدنی دکھایا گیا ہے۔ آمدنی کے معنی ہیں (IN - COME) یعنی" اندر آنے والی چیز"

دولت کی گردش

آپ سوچئے کہ ان تمام رقوم میں کوئی رقم بھی ایسی ہے جو کہیں باہر سے ملک کے اندر آئی ہے؟ کوئی بھی نہیں! یہ تمام رقوم ایسی ہیں جو ملک کے اندر ہی گردش کرتی رہی ہیں۔ ملک میں ایک ادارہ ہے جسے حکومت (گورنمنٹ) کہتے ہیں۔ اس کے ذمے ملک کا نظم و نسق برقرار رکھنا ہے۔ اس نظم و نسق کے لئے اُسے روپے کی ضرورت ہوتی ہے۔ حکومت یہ روپیہ، مختلف مدات میں، ملک کے لوگوں سے وصول کرتی ہے اور ملک ہی میں پھر خرچ کر دیتی ہے۔ لہٰذا یہ روپے کی گردش (CIRCULATION OF - MONEY) ہے۔ ملک کی آمدنی یا (IN - COME) نہیں ہے۔ اس لئے یہ جو کہا جاتا ہے کہ سنہ ۱۹۴۸-۴۹ء میں قریب چھیاسٹھ کروڑ روپے کی آمدنی تھی۔ اور سنہ ۱۹۵۶-۵۷ء کے بجٹ میں یہ آمدنی دگنی سے بھی زیادہ ہو گئی۔ تو اس کے بجائے کہنا یہ چاہیئے کہ سنہ ۱۹۴۸-۴۹ء میں حکومت اور لوگوں کے درمیان قریب چھیاسٹھ کروڑ روپے نے گردش کی — اور سنہ ۱۹۵۶-۵۷ء میں قریب ایک ارب انتالیس کروڑ روپے کے گردش کرنے کی توقع ہے۔ ملک کا جو روپیہ ملک کے اندر گردش کرتا رہے، اسے ملک کی آمدنی کہنا، حدیثِ بے خبراں ہے۔ اور اس گردش (CIRCULATION) کی زیادتی کو اقتصادی ترقی سمجھنا خوش فہمی!

اپنا ہی خون

اپنے روپے کو آمدنی سمجھنے کی مثال ایسی ہی ہے جیسا ایک کتا ایک سخت سی ہڈی چبا رہا تھا۔ ہڈی نے اُس کی زبان اور ہونٹ زخمی کر دیئے جن سے خون نکلنے لگ گیا۔ وہ کتا اس خون کو مزے لے کر چاٹتا تھا اور جی میں خوش ہو رہا تھا کہ وہ (خون) ہڈی سے نکل رہا ہے۔ حالانکہ وہ خود اپنا ہی خون تھا، کہیں باہر سے نہیں آ رہا تھا۔

جو روپیہ ہمارے ملک میں ایک جیب سے نکل کر دوسری جیب میں چلا جائے اُسے ملک کی آمدنی نہیں سمجھنا چاہیئے۔ ملک کی آمدنی وہ ہے جو کہیں باہر سے آئے جس طرح خوراک اسی کو کہتے ہیں جو باہر سے جسم کے اندر آئے جسم کے خون کا جسم کے اندر گردش کرنا "خوراک" یا "غذا" نہیں کہلا سکتا، نہ ہی یہ غذا کا کام دے سکتا ہے جس پر جسم کی پرورش کا دار و مدار ہے۔ حکومت کی آمدنی جسم کے اندر خون کی گردش کا نام ہے غذا کا نام نہیں۔ حکومت چونکہ ایک بہت بڑا ادارہ ہے اس لئے اس کا نظم و نسق اور آمدنی کا سلسلہ ذہن میں نہیں آتا۔ اسے سمجھنے کے لئے آپ اپنے قصبکی

میونسپل کمیٹی کی مثال

میونسپلٹی کو سامنے لایئے۔ یہ میونسپلٹی چونگی وصول کرتی ہے۔ کن سے؟ شہر کے لوگوں سے۔ یہ اس میونسپلٹی کمیٹی کی آمدنی ہے۔ اس آمدنی سے وہ شہر کی سڑکوں، نالیوں وغیرہ کا انتظام کرتی ہے۔ اب آپ سوچئے کہ چونگی کی آمدنی، میونسپل کمیٹی کی آمدنی ہوتی ہے

یا آپ کے شہر کی آمدنی۔ آپ یقیناً کہیں گے کہ وہ کھیتی کی آمدنی ہے، شہر کی آمدنی نہیں۔ اسی سے یہ سمجھ لیجئے کہ کسٹم، سیلز ٹیکس، انکم ٹیکس وغیرہ۔ سب حکومتوں کی آمدنی اور مدات ہیں، ملک کی آمدنی نہیں۔

یہاں سے لازماً یہ سوال سامنے آئے گا کہ یہ حکومت کی آمدنی کی مدات ہیں تو ملک کی آمدنی کونسی ہوگی؟ ملک کی آمدنی وہ ہوگی جو ملک کے اندر کہیں باہر سے آئے۔

ملک کی آمدنی

باہر سے کیسے آتے؟ اس طرح کہ (مثلاً) جاپان کو گندم کی ضرورت ہو اور ہمارے پاس فاضلہ گندم ہو۔ ہم یہ گندم جاپان کے ہاتھ فروخت کردیں۔ اس گندم کی قیمت فروخت ہمارے ملک کی آمدنی ہوگی اس لئے کہ یہ رقم باہر سے آئی ہے۔

لیکن ہم گندم باہر اسی صورت میں بھیج سکیں گے جب یہ اپنی ضرورت سے زائد ہو۔ اگر ہمارے ہاں گیہوں اتنا ہی پیدا ہو جتنے کی خود ہمارے ملک کو ضرورت ہے تو ہم باہر کیا بھیجیں گے؟ لہٰذا ہمارے ہاں گیہوں اتنا پیدا ہونا چاہیئے کہ ہم اپنے ملک کی ضروریات پورا کرنے کے بعد، دوسرے ملکوں کو بھی بھیج سکیں جس سے ہمارے ملک کو آمدنی ہوسکے۔ آپ پوچھیں گے کہ ہمارے ملک کو اس آمدنی کی ضرورت کیا ہے؟ اس کی ضرورت اس لئے ہے کہ جس طرح جاپان کو ہمارے ہاں سے گیہوں خریدنے کی ضرورت پڑتی ہے، ہمیں بھی دوسرے ملکوں سے کچھ نہ کچھ خریدنا پڑتا ہے (مثلاً دوائیاں، مشینری وغیرہ) یہ چیزیں اسی آمدنی سے خریدی جاسکتی ہیں۔

زمین کی پیداوار

لہٰذا بات سمٹ کر یہاں آگئی کہ کسی ملک کی حقیقی آمدنی وہ ہے جو اس ملک کی زمین سے پیدا ہو۔ اگر وہ پیداوار اتنی ہے کہ جس سے خود اس ملک کی اپنی ضروریات بھی پوری نہیں ہوسکتیں تو اس ملک کو روٹی بھی دوسروں سے خریدنی اور مانگنی پڑے گی۔ اگر یہ پیداوار اتنی ہے کہ وہ اس ملک کی اپنی ضروریات ہی پورا کرسکتی ہے تو اُسے دوسری چیزیں باہر سے نہیں مل سکیں گی۔ لیکن اگر یہ پیداوار اتنی ہے کہ وہ اپنی ضروریات پورا کرلینے کے بعد اسے باہر بھی بھیج سکتا ہے (خواہ خام شکل میں یا مصنوعات کی صورت میں) تو اس ملک کی کوئی ضرورت رُکی نہیں رہے گی۔ اس ملک کو فی الحقیقت خوشحال ملک کہہ سکیں گے۔

لہٰذا، کسی مُلک کی زندگی اور خوشحالی کا راز

زمین

میں ہے۔ خوش بخت ہے وہ ملک جس کے پاس زمین کافی ہو۔ جن ملکوں کے پاس زمین وافر نہیں، انھیں زندہ رہنے کے لئے کیا کچھ کرنا پڑتا ہے، اس کا اندازہ بعض مغربی ممالک سے لگا لیجئے۔ مثلاً انگلستان کو لیجئے۔ اسے اپنی خوراک کا بیشتر حصہ باہر سے منگانا پڑتا ہے۔ اس کے لئے اس نے پہلے تو یہ کیا کہ دور دراز ملکوں میں اپنی نوآبادیات (COLONIES) قائم کیں۔ ان آبادیوں سے اس نے خام پیداوار حاصل کی پھر اپنے ہاں ایسی چیزیں تیار کرنا

جن کے پاس زمین نہیں

شروع کیں جن کی دوسرے ممالک کو ضرورت تھی۔ پھر ایسی منڈیاں تلاش کیں جن میں ان مصنوعات کی کھپت ہو۔ لیکن یورپ میں اور ایسے ملک بھی تو تھے جنھیں اپنی مصنوعات کے لئے انہی منڈیوں کی ضرورت تھی۔ ظاہر ہے کہ جب منڈیاں تھوڑی ہوں اور مال بیچنے والے زیادہ تو ان میں باہمی کشمکش ہوگی۔ یہی وہ کشمکش ہے جو دنیا میں اس قدر خونریزیوں اور فساد انگیزیوں کا موجب بن رہی ہے۔ لیکن آپ سوچئے کہ جن ملکوں کو اس وقت ان مصنوعات کی ضرورت ہے اگر وہ انہیں خود اپنے ہاں تیار کرنے لگ جائیں تو پھر ان ممالک کا حشر کیا ہو جن کی زندگی کا دارومدار ان مصنوعات کی فروخت پر ہے؟ اس سے آپ نے پھر دیکھ لیا کہ کسی ملک کی زندگی اور خوشحالی کا راز ــــ

ارض یعنی زمین

میں ہے۔ بالفاظِ دیگر ملک کی حقیقی آمدنی وہ ہے جو زمین سے باہر آئے۔ اسی پر قوموں کی زندگی کا انحصار ہے جس ملک کی زمین کافی غلہ پیدا کر سکتی ہے وہ ملک کبھی بھوکا نہیں مر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے اَرْضٌ کو اسقدر اہمیت دی ہے۔ اس نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ ــ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَعَايِشَ وَمَنْ لَسْتُمْ لَهُ بِرَازِقِينَ - (۱۵/۲۰) ہم نے تمہارے لئے سامانِ زندگی ارض میں رکھا ہے۔ تمہارے لئے بھی اور ان کے لئے بھی جنھیں تم رزق بہم نہیں پہنچاتے۔

ارض کی اہمیت

جب انسان ابتدائی وحشی زندگی کے بعد تمدنی زندگی بسر کرنے کے قابل ہوا۔ تو اس سے کہا گیا تھا کہ وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَمَتَاعٌ إِلَىٰ حِينٍ - (۲/۳۶) تمہارے لئے ارض میں مستقر ہے اور ایک وقتِ معینہ تک سامانِ زیست۔ تمہارے لئے بھی اور تمہارے مویشیوں کے لئے بھی ــ مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِأَنْعَامِكُمْ - (۷۹/۳۳)

اس کے ساتھ ہی قرآن نے یہ بھی بتایا کہ زمین میں سامانِ زیست کے اس قدر خزانے مدفون ہیں کہ وہ کبھی ختم ہی نہیں ہو سکتے۔ لیکن وہ از خود باہر نہیں نکلتے۔ وہ خدا کے مقرر کردہ پیمانوں یعنی طبعی قوانین کے مطابق باہر آتے ہیں ــ وَإِن مِّن شَيْءٍ إِلَّا عِندَنَا خَزَائِنُهُ وَمَا نُنَزِّلُهُ إِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُومٍ ــ (۱۵/۲۱) دوسری جگہ بِقَدَرٍ مَّا يَشَاءُ - (۴۲/۲۷) کہا ہے یعنی اس کے لئے خدا نے قانون مقرر کر رکھا ہے۔ اور وہ قانون ایسا نہیں جس کا کسی کو علم نہ ہو۔ زندہ قوموں میں زراعت کے متعلق نت نئے تجربات ہوتے رہتے ہیں۔ مٹی (SOIL) میں نئی زندگی اور تازگی پیدا کرنے اور اس میں پیداوار کی صلاحیت اور توانائی بڑھانے کے لئے نئے آلات اور ادویات تیار کی جاتی ہیں۔ فصلوں کو کیڑوں اور موسموں کی شدت کے اثرات سے محفوظ رکھنے کے لئے نہایت مؤثر تدابیر اختیار کی جاتی ہیں۔ آب پاشی کے عجیب و غریب ذرائع دریافت کئے جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ اب مصنوعی بادل بھی

قوانینِ فطرت

بن رہے ہیں۔ یہ تمام کوششیں ان قوانینِ فطرت (بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ یا بِقَدَرٍ مَّا یَشَآءُ) کے مطابق انجام پاتی ہیں جو خدا کی طرف سے اس مقصد کے لئے متعین کئے گئے ہیں، کہ زمین کے خزائن کو باہر کیسے نکالا جائے۔ جو قومیں فطرت کے مقرر کردہ قوانین کے مطابق کوشش کرتی ہیں وہ خدا کی رحمتوں سے نوازی جاتی ہیں۔ ان کے ہاں رزق کی فراوانی ہوتی ہے۔ جو ایسا نہیں کرتیں خدا کے عذاب میں ماخوذ ہو جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ خدا نے پیداوار کی کمی کو عذاب کہا ہے۔ سورۃ اعراف میں ہے۔ وَ لَقَدْ اَخَذْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ بِالسِّنِیْنَ وَ نَقْصٍ مِّنَ الثَّمَرٰتِ ..... (۷/۱۳۰) ہم نے فرعون کی قوم پر قحط سالی اور پیداوار کی کمی کا عذاب مسلط کر دیا۔ دوسری جگہ خود بھوک کو خدا کا عذاب کہا گیا ہے۔

بھوک خدا کا عذاب ہے

سورۃ نحل میں ہے۔ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا۔ اللہ تمہیں ایک مثال کے ذریعے بات سمجھانا چاہتا ہے۔ قَرْیَةً ایک بستی تھی۔ کَانَتْ اٰمِنَةً مُّطْمَئِنَّةً یَّاْتِیْهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِّنْ کُلِّ مَکَانٍ۔ اس کے رہنے والے نہایت امن اور چین کی زندگی بسر کرتے تھے۔ ان کے لئے سامانِ زیست (رزق) ہر طرف سے بافراط چلا آتا تھا۔ فَکَفَرَتْ بِاَنْعُمِ اللّٰهِ۔ انھوں نے خدا کی ان نعمتوں کی ناسپاس گذاری کی۔ اُس کے قوانین کے اتباع سے انکار کر دیا۔ زمین سے جس طرح بافراط رزق حاصل کیا جانا چاہیئے تھا، ان طریقوں کو چھوڑ دیا۔ فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَ الْخَوْفِ۔ تو اللہ کے قانون کے مطابق ان پر بھوک کا عذاب نازل ہو گیا۔ اس طرح جب وہ روٹی کے لئے دوسروں کے محتاج ہو گئے تو جن سے روٹی ملنے کی توقع تھی، ان کا خوف بھی ان کے دل میں پیدا ہو گیا۔ وہ ان سے ہر وقت ڈرتے رہتے تھے۔ ان سے خائف رہتے تھے کہ کہیں وہ ان سے ناراض نہ ہو جائیں۔ یہاں یہ سوال پیدا ہو گا کہ خدا نے ان کی حالت ایسی کیوں کر دی! اس کے متعلق کہیں یہ نہ سمجھ لینا کہ خدا نے یونہی خواہ مخواہ ان کی حالت ایسی کر دی۔ قطعاً نہیں۔ خدا کسی پر کبھی ظلم نہیں کرتا۔ یہ سب کچھ ان لوگوں کی اپنی کرتوتوں کا نتیجہ تھا۔ یہ مصیبتیں ان کے اپنے ہاتھوں کی پیدا کردہ تھیں ــــ بِمَا کَانُوْا یَصْنَعُوْنَ۔ (۱۶/۱۱۲)

قرآن کی ان تصریحات کو سامنے رکھیئے اور پھر اپنے ملک کی حالت پر غور کیجئے۔ ہمارا ملک (سابق پنجاب اور سندھ کی وادی) ساری دنیا میں اناج کی کوٹھی (GRAINARY) کے نام سے مشہور تھی۔ اس میں اتنا غلہ پیدا ہوتا تھا کہ یہاں کے رہنے والے خود بھی بافراغت کھاتے پیتے تھے اور دوسروں کو بھی کھلاتے تھے۔ اب اسی ملک کی حالت یہ ہو چکی ہے کہ (پچھلے دنوں ٹنڈو جام میں تقریر کرتے ہوئے، امریکی نمائندہ مسٹر جان۔ او۔ بل نے بتایا کہ) ہم نے گذشتہ ڈیڑھ سال میں اسّی کروڑ روپے کا غلہ

ہماری زرعی پیداوار کی حالت

باہر سے منگایا ہے۔ آپ نے غور کیا؟ اسّی کروڑ روپے کا غلہ! ہمارے

بجٹ میں سارے سال کی آمدنی، ایک ارب انتالیس کروڑ دکھائی گئی ہے۔ ایک طرف اُسے رکھئے اور دوسری طرف یہ دیکھئے کہ ہم نے ڈیڑھ سال میں اسّی کروڑ روپے کا اناج دوسرے ملکوں سے منگایا ہے۔

یہ تو تھی گذشتہ ڈیڑھ سال کی بات۔ ہماری اسمبلی کے اجلاس منعقدہ اپریل ۱۹۶۵ء میں، وزیرِ خوراک مسٹر دلدار احمد نے تقریر کرتے ہوئے بتایا کہ اندازہ یہ ہے کہ مشرقی پاکستان میں امسال قریب چار لاکھ ساٹھ ہزار ٹن غلہ کی کمی ہوگی۔ اس کے بعد معلوم ہوا کہ حقیقی کمی اس اندازہ سے بھی زیادہ ہے۔ آخری اطلاع یہ ہے کہ ہمیں اس سال قریب پینسٹھ کروڑ روپے کا غلہ باہر سے منگانا پڑے گا۔ یعنی ہمارے بجٹ میں سال بھر کی آمدنی کا تخمینہ ایک ارب انتالیس کروڑ ہے اور اس میں سے پینسٹھ کروڑ کا غلہ باہر سے منگانا پڑیگا۔ یا للعجب!

یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ اگر دوسرے ملکوں سے کوئی چیز منگانی پڑے تو اس کی قیمت ہمارے روپے میں ادا نہیں کی جاسکتی۔ اُن کے سکے میں ادا کرنی پڑتی ہے جن سے وہ چیز خریدی جائے۔ ان کا سکہ ہمیں اسی صورت میں مل سکتا ہے جب ہم اُن کے ہاتھ کوئی اپنی چیز فروخت کریں۔ ہمارے ہاں دوسروں کے ہاتھ بیچنے کے لئے زمین کی پیداوار ہی ہوسکتی ہے۔ مثلاً پٹ سن، روئی، چائے وغیرہ۔ لیکن ہم نے گزشتہ دس سال میں جسقدر زرعی پیداوار باہر بھیجی ہے اس سے قریب چار گنا زیادہ قیمت کا غلہ باہر سے منگایا ہے۔ آپ سوچئے کہ سوائے اس کے کہ ہم دوسری قوموں سے قرضہ مانگیں یا امداد طلب کریں، ہمارے پاس روٹی حاصل کرنے کی اور کونسی شکل ہے؟

سب اپنا پیدا کردہ ہے

اور یہ سن کر آپ کلیجہ مسوس کر رہ جائیں گے کہ ہمارے ساتھ یہ کچھ کسی آسمانی آفت یا زمینی بلا کی وجہ سے نہیں ہوا۔ یہ سب قرآن کے الفاظ میں، ہمارے اپنے ہاتھوں کا پیدا کردہ ہے۔ ہمارے ہاں زمین کی کمی نہیں۔ لیکن ہماری نااہلی کی حالت یہ ہے کہ اول تو ہماری زمین کا بہت تھوڑا حصہ ہے جس میں کاشت ہوتی ہے۔ مثلاً ہمارے ہاں قابلِ کاشت زمین قریب ۲۲،۳۲،۳۱،۶۰۰ ایکڑ ہے۔ اس میں سے قریب ۵،۰۵،۵۹،۰۰۰ ایکڑ زمین میں غلّہ کی کاشت ہوتی ہے اور ۷۵،۹۸،۰۰۰ ایکڑ میں سبزیاں ترکاریاں بوئی جاتی ہیں۔ یعنی کل رقبہ زیرِ کاشت ۵،۸۱،۴۸،۰۰۰ ہے۔ بالفاظِ دیگر ہماری قابلِ کاشت زمین کا قریب ایک چوتھائی حصہ زیرِ کاشت ہے اور باقی تین چوتھائی زمین غیر آباد ہے۔ اس زیرِ کاشت رقبہ میں سے قریب دو لاکھ ایکڑ میں ہم تمباکو کی کاشت کرتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مثلاً کسی بھوکے کو ایک روپیہ ملجائے اور وہ اس روپیہ کا حقہ خرید لائے۔ ہم اپنے زیرِ کاشت رقبہ میں تمباکو کی کاشت کرتے ہیں اور روٹی دوسروں سے مانگ کر کھاتے ہیں۔ کیا ایسی قوم بھی دنیا میں کہیں اور دیکھی سُنی ہے؟

اب ایک قدم اور آگے بڑھیئے۔ ہمارا جس قدر رقبہ زیر کاشت ہے اس کا کافی حصہ دن بدن بیکار ہوتا چلا جا رہا ہے۔ چنانچہ مسٹر جان۔ او۔ بل کی تحقیق کے مطابق پاکستان میں ہر سال قریب ایک لاکھ ایکڑ زمین بیکار ہوتی جا رہی ہے۔ مغربی پاکستان میں بارانی رقبہ قریب چالیس فیصد ہے۔ اس میں ہر سال قریب بارہ ہزار ایکڑ زمین ناقابل کاشت ہوتی جا رہی ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ جس قدر رقبہ میں کاشت ہوتی ہے اس میں پیداوار کم ہوتی جا رہی ہے۔ مثلاً ۱۹۴۸-۴۹ء میں ہمارے ہاں چاول کی پیداوار قریباً گیارہ من فی ایکڑ تھی اور گیہوں کی قریب ساڑھے دس من فی ایکڑ۔ لیکن ۱۹۵۵-۵۶ء میں چاول کی پیداوار کی اوسط قریب نو من رہ گئی اور گیہوں کی قریب آٹھ من فی ایکڑ۔ ۱۹۴۸-۴۹ء میں چاول کی مجموعی پیداوار قریب چوراسی لاکھ ٹن تھی لیکن ۱۹۵۵-۵۶ء میں یہ پیداوار قریب ستر لاکھ ٹن رہ گئی۔ اسی طرح گیہوں کی مجموعی پیداوار ۱۹۴۸-۴۹ء میں قریب چالیس لاکھ ٹن تھی جو ۱۹۵۵-۵۶ء میں قریب تینتیس لاکھ ٹن رہ گئی۔ حالانکہ زیر کاشت رقبہ دونوں صورتوں (چاول اور گیہوں) کے لئے ۱۹۴۸-۴۹ء کے مقابلہ میں زیادہ تھا۔ ادھر زمین کی بیکاری اور پیداوار کی کمی کی یہ حالت ہے اور دوسری طرف ہماری آبادی قریب دس لاکھ نفوس سالانہ کی رفتار سے بڑھتی جا رہی ہے۔

اس کے مقابلہ میں ذرا دوسرے ملکوں کی حالت پر غور کیجئے۔ پہلے اوسط پیداوار کو لیجئے۔

ملک		چاول	نیشکر	گیہوں
۱۔ پاکستان	(اوسط پیداوار فی ایکڑ)	۱۱ (من)	۳۸۳	۸½
۲ جاوا	"	۱۸	۱۳۳۶	×
۳ جاپان	"	۴۴	×	۱۹
۴۔ مصر	"	۴۳	۶۳۳	۱۹

یہ اس لئے کہ (علاوہ دیگر وجوہات) جاپان میں مصنوعی کھاد کا استعمال قریب ساٹھ پونڈ فی ایکڑ کے حساب سے ہوتا ہے۔ مغربی یورپ میں قریب تین سو پونڈ فی ایکڑ کے حساب سے اور پاکستان میں صرف ایک پونڈ فی ایکڑ کے حساب سے۔ حالانکہ اس کھاد کا استعمال بیس سے چالیس فیصد پیداوار بڑھاتا ہے۔

اس کے بعد اس حقیقت پر بھی غور کیجئے کہ

(۱) مغربی یورپ کے پاس ساری دنیا کے رقبۂ زمین کا قریب ۲½ (فیصد) حصہ ہے اور پندرہ فیصد آبادی لیکن یہ کل دنیا کی خوراک کا ایک تہائی حصہ پیدا کر دیتا ہے۔

(۲) اس میں اگر روس اور شمالی امریکہ کو بھی شامل کر لیا جائے تو دنیا کی کل آبادی کا ایک تہائی حصہ

ان ممالک میں بستا ہے اور دنیا کی خوراک کا ۳/۴ حصہ ان ممالک میں فروخت ہو جاتا ہے۔ باقی ۱/۴ حصہ اور ساری دنیا کے لئے بچتا ہے۔ اس میں سے ایشیا کے حصہ میں صرف سترہ فیصد آتا ہے۔

ان حالات کے پیشِ نظر آپ سوچئے کہ ہم کہاں ہیں، کدھر جا رہے ہیں اور اس کا انجام کیا ہوگا؟ اول تو یہی چیز قابلِ غور ہے کہ ہمیں ہر سال جس قدر غلہ کی ضرورت پڑتی ہے اور جسے خریدنے کے لئے ہمارے پاس زرِ مبادلہ نہیں ہوتا، وہ ہمیں قرضہ یا امداد کے طور پر کب تک ملتا رہے گا؟ دوسرے یہ کہ ہمیں جو قرضہ یا امداد ملتی ہے۔ اس کی ہمیں قیمت کس قدر ادا کرنی پڑ رہی ہے۔؟

اب سوال ہے کہ اس صورتِ حالات سے نکلنے کی شکل کیا ہے؟ اس کے متعلق کہا یہ جائے گا کہ ہمیں زمین کو بہتر بنانے اور اس کی پیداوار بڑھانے کے سوال پر خاص توجہ دینی چاہیئے۔ جس قدر افتادہ زمین ہے اسے قابلِ کاشت بنانا چاہیئے۔ قابلِ کاشت زمین کو بے کار نہیں رہنے دینا چاہیئے۔ نئے آلات اور ادویات سے مٹی (soil) کو زیادہ سے زیادہ تندرست اور توانا بنانا چاہیئے وسائلِ آب پاشی کو بہتر بنانے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ یہ سب ٹھیک ہے اور ان تدابیر کا اختیار کرنا نہایت ضروری۔ لیکن یہ ضابطہ خداوندی کا صرف ایک پہلو ہے جسے طبعی قوانین کہتے ہیں۔ اس کا دوسرا پہلو بھی ہے اور وہ اس سے بھی زیادہ اہم ہے۔ بلکہ یوں سمجھئے کہ قرآن کی رُو سے وہ گوشہ بنیادی ہے۔ اس وقت ہماری حالت یہ ہے کہ ایک ایک زمیندار دس دس ہزار (بلکہ ایک ایک لاکھ) ایکڑ زمین کا مالک ہے۔ اُسے اس کی پرواہ ہی نہیں ہوتی کہ اس کی زمین کی حالت کیا ہے۔ اس کی پیداوار گھٹ رہی ہے یا بڑھ رہی ہے۔ وہاں سے جو کچھ بھی آ جائے اس کے لئے کافی سے زیادہ ہوتا ہے۔ زمین کاشتکاروں کے پاس ہوتی ہے لیکن چونکہ یہ اس کے مالک نہیں ہوتے، محض مزدور ہوتے ہیں، اس لئے یہ اس کے سنوارنے کی فکر نہیں کرتے اور اگر کرنا چاہیں بھی تو ان کے پاس اس کے وسائل ہی نہیں ہوتے۔ ہمارے کاشتکاروں کی حالت جس قدر قابلِ رحم ہے، اس کا اندازہ ہم شہری بمشکل لگا سکتے ہیں۔ ہم پرانے زمانے کے غلاموں کے حالات پڑھ پڑھ کر خون کے آنسو بہا لیا کرتے ہیں۔ اگر ہم کہیں ان کاشتکاروں کی حالت کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں تو نہ معلوم ہم پر کیا گزر جائے؟ ان بے چاروں کو محض شکل و صورت کے اعتبار سے انسان سمجھئے ورنہ ان سے جو سلوک روا رکھا جاتا ہے وہ حیوانات سے بدتر ہے۔ ہمارے ہاں لیبر (مزدوروں) کے حالات کو بہتر بنانے کے لئے بہت کچھ کیا یا کہا جاتا ہے لیکن مزدوروں میں یہ کاشتکار شامل نہیں کئے جاتے۔ ان سے صرف وہ مزدور مراد ہیں جو کارخانوں میں کام کرتے ہیں۔ ہمارے ملک کی اسّی فیصد آبادی کاشتکاروں پر مشتمل ہے (اور کل مزدوروں کا ۷۸٪ فیصد حصہ کاشتکار ہیں) باقی بیس فیصد میں سے دس فیصد کارخانوں

اِس کا علاج؟

کاشتکاروں کی حالت

کے مزدوروں کو لیجیئے اور دس فیصد زمیندار۔ تاجر۔ کارخانہ دار۔ ملازمت پیشہ وغیرہم۔ ہم دس فیصد آبادی (کارخانوں کے مزدوروں) کے متعلق تو اتنا کچھ کہتے اور کرتے ہیں لیکن اسی فیصد آبادی (کاشتکاروں) کے متعلق کبھی خیال تک بھی نہیں کرتے کہ یہ بھی خدا کی مخلوق ہیں۔ مزدوروں کے متعلق قانون موجود ہے کہ ان سے اتنے گھنٹے سے زیادہ کام نہیں لیا جا سکتا۔ اور (LIVING WAGE) سے کم اجرت نہیں دی جا سکتی یعنی انہیں اتنی اجرت ضرور ملنی چاہیئے جن سے ان کا گزارہ ہو سکے نیز مزدوروں کی صحت، آسائش، تفریح کے لئے بھی قوانین موجود ہیں۔ لیکن بیچارے کاشتکاروں کے متعلق کسی نے کبھی نہیں سوچا کہ انہیں کتنے گھنٹے روزانہ کام کرنا پڑتا ہے اور سال کے بعد انہیں ملتا کیا ہے؟ نہ کسی کو ان کی صحت کا خیال ہے، نہ آسائش کا، نہ مکان کا، نہ خوراک کا۔ وہ اپنے بیلوں اور گدھوں سے زیادہ محنت کرتے ہیں اور انہیں ان سے بھی کم کھانے کو ملتا ہے۔ آپ سوچئے کہ جو کاشتکار ان حالات میں کام کریں، وہ زمین کو سنوارنے کی فکر خاک کریں گے؟

اب آپ پوچھیں گے کہ خدا کے اس قانون نے جسے اوپر بنیادی بتایا گیا ہے ان خرابیوں کا علاج کیا تجویز کیا ہے؟ اس نے بڑا سیدھا اور صاف علاج تجویز کیا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ زمین تمام انسانوں کے لئے سامانِ زندگی (رزق) حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔ اس لئے اس پر کسی کی ذاتی ملکیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جس طرح فضا کی ہوا، سورج کی روشنی، ندی کا پانی ہر ضرورت مند کے لئے یکساں طور پر کھلا رہتا ہے اور کسی کو اس کی اجازت نہیں دی جا سکتی کہ ان پر ذاتی قبضہ جمالے۔ اسی طرح زمین کے متعلق بھی خدا کا قانون یہی ہے کہ وہ تمام ضرورت مندوں کے لئے یکساں طور پر کھلی رہنی چاہیئے۔ کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہونی چاہیئے۔ سورہ حم سجدہ میں ہے — قُلْ اَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُوْنَ بِالَّذِیْ خَلَقَ الْاَرْضَ فِیْ یَوْمَیْنِ وَ تَجْعَلُوْنَ لَهٗۤ اَنْدَادًا۔ ذٰلِكَ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ — کیا تم اس خدا (کے قانون) سے انکار کرتے ہو جس نے اس زمین کو دو مراحل میں پیدا کیا (پہلا مرحلہ وہ تھا جب وہ اس قدر گرم تھی کہ اس میں کچھ پیدا ہی نہیں ہو سکتا تھا۔ اور دوسرا مرحلہ وہ جس میں یہ اس قابل ہو گئی کہ اس پر جاندار مخلوق رہنے لگی اور یہ ان کے لئے سامانِ زندگی بہم پہنچانے لگی) کیا تم اس زمین کے معاملہ میں (جو خالصتہً خدا کی ملکیت ہے) اس کے ہمسر بناتے ہو؟ اس نے زمین کو تمام نوعِ انسانی کی پرورش کا ذریعہ بنایا ہے۔ کیونکہ وہ رب العالمین (تمام انسانوں کا پرورش کرنے والا) ہے) وَجَعَلَ فِیْهَا رَوَاسِیَ مِنْ فَوْقِهَا — اس نے زمین کی سطح پر پہاڑ بنائے (جو اس کے سلسلہ آب رسانی کا اہم ذریعہ ہیں) — وَبٰرَكَ فِیْهَا — اور اس میں رزق پیدا کرنے کی صلاحیت پیدا کی — وَقَدَّرَ فِیْهَاۤ اَقْوَاتَهَا فِیْۤ اَرْبَعَةِ اَیَّامٍ — اور اس کی پیداوار (فصلوں) کے لئے چار موسم مقرر کئے — سَوَآءً لِّلسَّآئِلِیْنَ (۴۱)

زمین پر ذاتی ملکیّت جائز نہیں

یہ تمام ضرورت مندوں کے لئے یکساں طور پر کھلی رہنی چاہیئے۔

آپ نے غور کیا کہ قرآن نے کیا کہا ہے؟ اس نے کہا یہ ہے کہ لوگوں کو زمین کا مالک قرار دینے کا مطلب یہ ہے کہ تم انہیں خدا کا ہمسر بنا رہے ہو۔ اسی ضمن میں سورۃ بقرہ میں کہا ہے کہ خدا نے تمہارے پاؤں کے نیچے زمین پیدا کی۔ اوپر آسمانی گنبد بنائے۔ بادلوں سے پانی برسایا۔ اس سے فصلیں پیدا کیں تاکہ وہ تمہارے لئے وجہ زینت بن سکیں۔ اس کے بعد ہے فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ۔ (۲:۲۲) لہٰذا تم خدا کے ہمسر نہ بناؤ۔ اگر تم ذرا بھی علم و عقل سے کام لو تو یہ حقیقت تم پر واضح ہو جائے گی کہ اس کا کوئی ہمسر ہو نہیں سکتا۔ سورۂ عبس میں ہے کہ انسان کو چاہیئے کہ اپنے رزق (خوراک) پر غور کرے اور سوچے کہ اس میں کون سی چیز ہے جو اس کی اپنی بنائی ہوئی ہے۔ زمین میں پیداوار کی صلاحیت کا موجود ہونا، بادلوں سے پانی کا برسنا۔ اس سے بیج کا پھوٹ کر کونپل بننا کونپل کا بڑا ہو کر پودا بننا، پودے میں پھل اور اناج پیدا ہو جانا، یہ سب خدا کے قانون کے مطابق ہوتا ہے۔ لہٰذا اسے مَتَاعًا لَّكُمْ وَ لِاَنْعَامِكُمْ۔ (۷۹:۳۳) ہونا چاہیئے۔ یعنی تمہارے اور تمہارے مویشیوں کے لئے سامانِ زندگی۔ نہ یہ کہ لوگ لکیریں کھینچ کھینچ کر اس کے مالک بن بیٹھیں، خود عیش اڑائیں اور کاشتکار بیچارے بھوکوں مریں۔

دو خدا؟

سورۂ واقعہ میں اسے اور بھی واضح الفاظ میں بیان کیا گیا ہے جہاں کہا ہے کہ اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تَحْرُثُوْنَ۔ کیا تم نے کبھی اس پر بھی غور کیا کہ تم جو کھیتی باڑی کرتے ہو تو اس میں تمہارا حصہ کس قدر ہے اور ہمارے قانون نشوونما کا حصہ کس قدر؟ تم ہل چلا کر زمین میں بیج ڈال لیتے ہو۔ اس کے بعد ہے ءَاَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗۤ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ۔ کیا اس بیج کو فصل میں تم تبدیل کرتے ہو یا ہم تبدیل کرتے ہیں؟ اگر ہمارا قانون اس دانہ کو فصل میں تبدیل نہ کرے تو تمہاری ساری محنت اکارت چلی جائے اور تم سر پیٹ کر رہ جاؤ؟ اس کے بعد پانی کے متعلق یہی کچھ کہا ہے اور پھر آگ کے متعلق۔ اور ان سب کے بعد ہے کہ ہم نے یہ سارا سلسلہ اس لئے قائم کر رکھا ہے کہ یہ مَتَاعًا لِّلْمُقْوِيْنَ بن سکے۔ (۵۶:۷۳) یعنی بھوکوں کے لئے سامانِ رزق بن سکے۔

یہ ہے خدا کا وہ قانون جسے اس نے اس سلسلہ میں بنیادی قرار دیا ہے لیکن وہ کہتا ہے کہ تمہاری حالت یہ ہے کہ تم یہ تو مانتے ہو کہ سورج خدا کا ہے۔ اس پر کسی کی ملکیت جائز نہیں۔ ہوا خدا کی ہے۔ یہ ہر ایک کے لئے کھلی رہنی چاہیئے۔ چاند اور ستاروں کی روشنی خدا کی ہے اس سے ہر ایک کو مستفید ہونا چاہیئے لیکن جب تم زمین کی طرف آتے ہو تو اس کے متعلق کہہ دیتے ہو کہ نہیں! اس پر لوگوں کی ذاتی ملکیت ہونی چاہیئے تاکہ غریب اور کمزور بھوکے مریں۔ وہ کہتا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ آسمانوں کا الٰہ (حاکم اور مالک) کوئی اور ہے اور زمین کا الٰہ کوئی اور۔ سورۂ انبیاء میں ہے۔ اَمِ اتَّخَذُوْۤا اٰلِهَةً مِّنَ

الْاَرْضِ هُمْ يُنْشِرُوْنَ ۔ کیا انھوں نے ارض میں اور الٰہ تجویز کر رکھے ہیں جن کے سہارے یہ پھیلنا چاہتے ہیں۔ اسکے بعد ہے۔ لَوْ كَانَ فِيْهِمَا اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا ۔ (۲۱/۲۲) اگر اس میں اللہ کے علاوہ اور الٰہ ہوتے تو ساری کائنات درہم برہم ہو جاتی۔ اس لئے هُوَ الَّذِيْ فِي السَّمَآءِ اِلٰهٌ وَّ فِي الْاَرْضِ اِلٰهٌ (۴۳/۸۴) آسمانوں میں الٰہ بھی وہی ہے اور زمین میں الٰہ بھی وہی۔

کرنے کا کام تصریحاتِ بالا سے یہ حقیقت سامنے آگئی ہوگی کہ حکومت کے لئے (سردست) کرنے کا کام یہ ہے کہ:

(۱) زمین پر بڑے بڑے زمینداروں کی ملکیت کو ختم کر دیا جائے اور ساری زمین مملکت کی تحویل میں دے دی جائے۔ حکومت غیر آباد زمین کو آباد کرنے کا ایک پلان بنائے اور اس پر فی الفور عمل درآمد شروع کر دے۔

(۲) ہر شخص کی تحویل میں (ملکیت میں نہیں بلکہ تحویل میں) اتنی زمین دے دی جائے جسے وہ خود کاشت کر سکے۔

(۳) حکومت اس زمین کے نقائص دور کرنے اور اسے توانا اور تندرست بنانے کے ضروری سامان اور اسباب مہیا کرے۔

(۴) حکومت خود فیصلہ کرے کہ کتنے رقبہ میں کس جنس کی کاشت ہوگی۔

(۵) اس رقبہ کی پیداوار میں سے کاشت کرنے والے کی ضرورت کے مطابق اس کے پاس رہنے دی جائے اور باقی جنس کو حکومت معقول اور مناسب قیمت پر خرید لے۔ اس رقم کو اس کاشتکار کی آمدنی قرار دیا جائے۔ اور ملک کے عام انکم ٹیکس کے قاعدے کے مطابق اس آمدنی پر ٹیکس لگایا جائے۔ اس کے علاوہ اس سے مالیہ وغیرہ کچھ وصول نہ کیا جائے۔

(۶) فصلوں کو آفاتِ ارض و سماوی سے محفوظ رکھنے کی ذمہ داری حکومت پر ہو۔ نیز کاشتکار کی بیماری یا اس کے مال مویشی کے نقصان کی صورت میں اس کی مناسب امداد کی ذمہ داری بھی۔

(۷) ملحقہ دیہات کو چھوٹے چھوٹے حلقوں میں تقسیم کر کے، میونسپل کمیٹی کے انداز سے، اہل دیہات کی صحت تعلیم وغیرہ کا انتظام کیا جائے۔

اس کے بعد آپ دیکھیں گے کہ خدا کا یہ وعدہ کس طرح پورا ہوتا ہے کہ وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰٓى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ (۷/۹۶) اگر ان بستیوں والے خدا کے اس قانون کی صداقت کو تسلیم کر لیتے اور اس کی پوری پوری نگہداشت کرتے تو ہم ان پر زمین اور آسمان کی برکتوں کے دروازے کھول دیتے۔

ان دروازوں سے جو آمدنی آئے اُسے کہا جائے گا "ملک کی آمدنی" اور اسی پر ملک کی فلاح و بہبود کا دارومدار ہوگا۔ فلاح کے تو معنی ہی کھیتی کے ہیں۔

اگر ہم نے یہ کچھ نہ کیا تو ہمارا کہیں ٹھکانہ نہیں۔ سب سے زیادہ خطرہ اس بات کا ہے کہ ان حالات سے فائدہ اٹھا کر کمیونزم کا طوفانِ بلا کہیں ادھر کا رُخ نہ کر لے اور اس کا کسے علم نہیں کہ ؎

اِس سیلِ سبک سیر و زمیں گیر کے آگے
عقل و نظر و علم و ہنر ہیں خس و خاشاک

نہ صرف یہ بلکہ دین اور انسانیت بھی!

اس سے بچنے کا طریق صرف یہ ہے کہ ہم خدا کے ضابطۂ قانون کے دامن میں پناہ لیں اور زمین کو ذاتی ملکیت کے پنجوں سے نکال کر ملّت کی مشترکہ تحویل میں دے دیں جو اسے ضرورتمندوں میں حسبِ ضرورت تقسیم کرتی رہے۔ اسی کا نام ہے خدا کی ملک کو خدا کے حوالے کرنا۔ ؎

مُلکِ یزداں را بہ یزداں باز دہ
تا ز کارِ خویش بکشائی گرہ

جیسا کہ شروع میں بتایا گیا ہے، یہ مقالہ ۱۹۵۷ء میں لکھا گیا تھا۔ اس کے بعد حکومت کی طرف سے اس اہم اور نازک مسئلہ کے حل کے لئے متعدد اقدامات کئے گئے۔ مثلاً:

(۱) زرعی اصلاحات کے سلسلہ میں زمین کی ملکیت کا رقبہ پانچ سو ایکڑ تک محدود کر دیا گیا۔

(۲) وسائلِ آب پاشی کو بہتر بنانے کی کوشش کی گئی۔ سیم اور تھور کی بلاؤں سے نجات حاصل کرنے کے لئے بھی مختلف تجاویز بروئے کار لائی گئیں۔

(۳) مصنوعی کھاد درآمد اور تیار کرنے کا انتظام کیا گیا۔

(۴) غیر ممالک سے گندم کا بہتر بیج منگایا گیا جس کے نتائج بڑے حوصلہ افزا ہیں۔ یہ اقدامات درست اور صحیح تھے لیکن سوال یہ ہے کہ کیا اس سے قوم کے اس سب سے اہم مسئلہ کا حل مل گیا؟ اس سلسلہ میں ہمارے سامنے محترم ہاشمی صاحب، وائس چانسلر زرعی یونیورسٹی لائلپور کا وہ مقالہ ہے جو پاکستان ٹائمز کی ۳۰ جنوری کی اشاعت میں شائع ہوا ہے۔ اس میں وہ لکھتے ہیں کہ:

(۱) گذشتہ دس سال میں ہمیں اوسطاً پچاس کروڑ روپیہ سالانہ کا غلہ دوسرے ملکوں سے درآمد کرنا پڑا۔ لیکن امسال ہمیں قریب ایک ارب (یعنی سو کروڑ) روپے کا غلہ منگانا پڑیگا۔ واضح رہے کہ یہ سو کروڑ روپے کا اندازہ

آج سے بہت پہلے، ایک وزیر مملکت نے لگایا تھا لیکن اس سال امساکِ باراں کی وجہ سے جو غیر متوقع حالات پیدا ہو رہے ہیں ان کے پیشِ نظر معلوم نہیں کہ ہمیں کس قدر نائیڈ غلہ درآمد کرنا پڑے گا۔)

(۲) غلّہ کی اس قدر درآمد کے باوجود، ہمارے ملک کے باشندوں کو اتنی خوراک نہیں مل رہی جتنی کہ انہیں طبعی طور پر ضرورت ہے۔ یہاں جسم کی توانائی کو برقرار رکھنے کے لئے قریب (۲۳۰۰) کیلوریز فی کس روزانہ درکار ہیں لیکن ہمیں صرف (۲۰۸۰) کیلوریز میسر آسکی ہیں (واضح رہے کہ یہ اوسط اس مفروضہ پر ہے کہ غلہ کی تقسیم ضروریات کے لحاظ سے مساویانہ ہوتی ہے)

(۳) ہمیں صحت کو برقرار رکھنے کے لئے جس قدر پروٹین (لحمیات) کی ضرورت ہے، یہاں اس کا ایک تہائی حصہ فی کس میسر آرہا ہے۔ اس سے قوم کی صحت دن بدن گرتی جا رہی ہے اور رفتہ رفتہ انکی قوتِ عمل اور صلاحیتِ برداشت میں کمی واقع ہوتی جا رہی ہے۔ ایسی قوم زیادہ عرصہ تک مشقت طلب کاموں کو سرانجام دینے کے قابل نہیں رہتی۔

(۴) ہر سال قریب ایک لاکھ ایکڑ زمین سیم اور تھور کی وجہ سے ناقابلِ کاشت ہوتی جا رہی ہے۔

(۵) ہمارے ہاں اوسط پیداوار دنیا میں سب سے کم ہے۔ حتیٰ کہ جاپان اور مصر میں اوسط پیداوار ہم سے تین سے لے کر پانچ گنا تک زیادہ ہے۔

(۶) ہمارے ہاں کاشتکار کے لئے ساڑھے بارہ ایکڑ قطعۂ اراضی کم از کم یونٹ قرار دیا گیا ہے لیکن عملاً ہر کاشتکار کے حصہ میں اوسطاً (۳٫۶) ایکڑ رقبہ آتا ہے۔

(۷) ہمارے ہاں شہری آبادی کے مقابلہ میں دیہاتی آبادی کی اوسط آمدنی بے حد کم ہے۔ مثلاً

سال	اوسط آمدنی شہری آبادی	اوسط آمدنی دیہاتی آبادی
۱۹۴۹ء	۱۰۹۷	۱۹۷
۱۹۶۴-۶۵ء	۱۱۵۶	۱۹۴

(۸) ہمارے ہاں پیداوار کی تو یہ حالت ہے لیکن ہماری آبادی میں ہر سال قریب بیس لاکھ کا اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ اس رفتار سے، اس صدی کے اختتام تک، ہماری آبادی اب سے دگنی (یعنی قریب بیس کروڑ) ہو جائیگی سوچئے کہ اس طرح ہماری غلّہ کی ضروریات ہر سال کس قدر بڑھتی چلی جائیں گی۔

اس صورتِ حالات کے ذمہ دار بہت سے عناصر ہیں۔ لیکن بہ حالتِ موجودہ بھی ایک بات بالکل واضح اور نمایاں ہے اور وہ یہ کہ ہمیں ضرورت ہے گیہوں کی اور ملک کی بہترین زمینوں کے بیشتر حصہ میں گنے اور تمباکو کی

فصلوں (CASH CROPS) کی کاشت ہو رہی ہے۔ آپ اٹک سے اُس پار جائیے یا سندھ کی تازہ زیرِ کاشت زمینوں کو دیکھئے۔ یہاں سے وہاں تک گنا اور تمباکو لہلہاتا دکھائی دے گا۔ پہلے گنے کو لیجئے اور دیکھئے کہ ملک میں جس قدر شکر کے کارخانے قائم کئے گئے ہیں کیا اُن کی اِس ملک میں ضرورت بھی تھی؟ چاہیئے یہ تھا کہ پہلے ملک کی چینی کی واقعی ضرورت کا جائزہ لیا جاتا اور اس کے مطابق چینی تیار کیجاتی ــــ "واقعی ضرورت" اس لئے کہ اس وقت چینی جن مصارف میں لائی جا رہی ہے ان میں واقعی ضرورت کا حصہ بہت کم ہے، نیز چینی کا کثرتِ استعمال جسطرح صحتِ عامہ کو تباہ کر رہا ہے، اسکی طرف کسی کا خیال ہی نہیں جاتا۔ جہاں تک تمباکو کا تعلق ہے اسکی واقعی ضرورت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ زہر ہے جو نوعِ انسانی کو بُری طرح ہلاک کر رہا ہے۔ اقوامِ عالم اس شجرِ خبیثہ کے متعلق سائنٹیفک ریسرچ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچ رہی ہیں کہ اس سے علاوہ دیگر امراض، سرطان جیسی لاعلاج بیماری لاحق ہو جاتی ہے۔ وہ قومیں اسکی روک تھام کی فکر کر رہی ہیں اور ہمارا ملک جسے کھانے کے لئے روٹی تک کافی مقدار میں نہیں ملتی، دھڑا دھڑ سگریٹ کی فیکٹریاں نصب کئے جا رہا ہے۔ قوم کا جس قدر روپیہ سگریٹ کے راستے، دھواں بن کر اُڑ اور راکھ بنکر تباہ ہو جاتا ہے، اگر اس کے اعداد و شمار سامنے آجائیں تو آپ کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جائیں۔ یہ سامانِ ہلاکت اس ملک میں عام ہو رہا ہے جس کے پاس کھانے کو روٹی تک نہیں۔ زائد از ضرورت شوگر ملز اور بے ضرورت سگریٹ ملز قائم کرنے کا نتیجہ یہ ہے کہ:

(۱) زمین کا بہترین رقبہ جس میں گیہوں بوئی جا سکتی تھی، گنے اور تمباکو کی بھینٹ چڑھ رہا ہے۔

(۲) بے ضرورت شکر اور سگریٹ کے استعمال سے صحتیں تباہ ہو رہی ہیں اور روپیہ برباد۔

(۳) ملک میں غلہ کی پیداوار کم ہو رہی ہے اور اس کمی کو پورا کرنے کے لئے ہمیں ــــ غیروں کا محتاج ہونا پڑتا ہے۔ اس کے لئے (مالی قیمت کے علاوہ) جس قدر سیاسی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے اسکی وضاحت کی ضرورت نہیں۔

پچھلے دنوں حکومتِ مغربی پاکستان نے ایک عالمگیر مہم شروع کی جس میں کاشتکاروں سے پیہم اپیلیں کی گئیں کہ وہ (خدا کے لئے) آئندہ سال زیادہ سے زیادہ رقبہ میں گیہوں کاشت کریں۔ سوال یہ ہے کہ اگر کاشتکاروں کو دوسری فصلیں بونے سے زیادہ منافع ملتا ہو، تو وہ اپنے رقبوں میں گیہوں کی کاشت کیوں کریں؟ یہاں سے وہ بنیادی سوال سامنے آتا ہے جسے ہم نے (۱۹۵۴ء کے) مقالہ کے اخیر میں پیش کیا تھا یعنی یہ کہ زمین پر لوگوں کی ذاتی ملکیت ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ حکومت کسی کو مجبور نہیں کر سکتی کہ ــــ (۱) وہ اپنی زمین کو بالضرور زیرِ کاشت لائے۔ اگر کوئی زمیندار اپنی زمین کو افتادہ (بلا کاشت) رکھنا چاہے تو حکومت

اس کے خلاف کچھ نہیں کر سکتی ـــ اور (۲) حکومت کسی زمیندار کو اس پر بھی مجبور نہیں کر سکتی کہ وہ اپنی زمین میں فلاں فصل کی کاشت کرے اور فلاں کی نہ کرے۔ ایسا کرنا اس کے حقِ ملکیت میں مداخلت ہوگی۔

آپ نے غور فرمایا کہ زمین پر انفرادی ملکیت کے نتائج کس قدر دور رس ہیں؟ ـــ یہ وجہ ہے کہ قرآن کی رُو سے رزق کے سرچشمہ (زمین) پر انفرادی ملکیت کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ یہ تمام انسانوں کے لئے یکساں سامانِ زیست مہیا کرنے کا ذریعہ ہے۔ انسانوں کے اجتماعی نظام (مملکت) کا فریضہ یہ ہے کہ وہ اس کا انتظام ایسا کرے جس سے تمام افرادِ معاشرہ کو بلا دقت رزق ملتا جائے۔ اس مقصد کے لئے، اسلامی نظامِ معیشت میں، زمین مملکت کی تحویل میں رہتی ہے۔ اس نظام کی رُو سے، مملکت، افرادِ معاشرہ کی ضروریات کا جائزہ لے گی اور اس کے مطابق زمین میں مختلف فصلوں کی کاشت کرائے گی۔ اس انتظام کے لئے، حالات کے تقاضوں کے مطابق، جو صورت بہتر نظر آئے، اختیار کی جا سکتی ہے۔ اس وقت تک، اس سلسلہ میں، دنیا نے جو مختلف تجارب کئے ہیں، انہیں سامنے رکھتے ہوئے، اس قسم کا انتظام اطمینان بخش نظر آتا ہے کہ:

(۱) ایک گاؤں کی زمین، سارے گاؤں والوں کی مشترکہ کاشت میں رہے۔

(۲) اس زمین میں کواپریٹو فارمنگ کے طریق پر حکومت کے زیر ہدایت کہ کس قدر رقبہ میں کون سی جنس بوئی جائے، مشترکہ کاشت کی جائے۔ اس کے لئے حکومت کی طرف سے ہر قسم کی سہولتیں بہم پہنچائی جائیں۔

(۳) مشترکہ پیداوار میں سے، سب سے پہلے، اس گاؤں کے تمام افراد کی ضروریات کے مطابق غلہ تقسیم کر دیا جائے۔

(۴) فاضل غلہ کو حکومت کسی متعین قیمت پر خرید لے اور اس سے گاؤں والوں کو جو روپیہ حاصل ہو اسے، افراد کی محنت کی نسبت سے ان میں تقسیم کر دیا جائے (یعنی جس نے جس قدر کام کیا تھا، اس نسبت سے اسے معاوضہ دے دیا جائے) اس روپیہ کو وہ اپنے ذوق اور انتخاب کی رعایت سے جس طرح جی چاہے صرف کریں۔

(۵) ملک کی ترقی کے منصوبوں میں زرعی معیشت کو سر فہرست رکھا جائے۔ سامانِ تعیش ـــ (LUXURY GOODS) کی درآمد اور ساخت کو بند کر دیا جائے ـــ جو ملک بھوک سے مر رہا ہو اس میں سامانِ تعیش کے استعمال کے معنی کیا ہیں؟ ـــ ان کی جگہ زرعی معیشت سے متعلق مشینری اور آلات درآمد اور تیار کئے جائیں۔ اس کے ساتھ ہی، زرعی تعلیم پر زیادہ سے زیادہ زور دیا جائے۔ زرعی سائنٹسٹ

زیادہ سے زیادہ تعداد میں تیار کئے جائیں۔ دیہی ملازمت کو اس قدر جاذب بنایا جائے کہ ملک کے بہترین دماغ اس طرف کھنچکر آئیں۔ ان کی تحقیقاتی کاوشوں کی حوصلہ افزائی اور قدر کی جائے۔ ہاشمی صاحب نے اپنے مقالہ میں لکھا ہے کہ اس وقت دنیا میں قریب پچاس ہزار کیمیاوی اشیاء زراعت کو ترقی دینے کے لئے دریافت اور ایجاد ہو چکی ہیں — اور ہمارے ہاں ابھی تک گوبر پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

(۲) دوسری طرف، بچوں کی پیدائش پر کنٹرول کے لئے مؤثر طریق کار اختیار کیا جائے۔ اس وقت جو کچھ ہو رہا ہے اس کی حیثیت محض، بکار سرکار (آفیشل ڈیوٹی) کی سی ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اس مسئلہ کی اہمیت اور ضرورت کو اس قدر آسان اور دلنشیں انداز سے عام کیا جائے کہ ایسا کرنا عوام کے دل کا تقاضا بن جائے۔ یاد رکھئے! یہ جو فتنہ پھیلایا جا رہا ہے کہ خاندانی منصوبہ بندی از روئے شریعت ناجائز ہے، تو یہ بھی اسی سازش کی ایک کڑی ہے جس سے مقصد یہ ہے کہ پاکستان ایک طاقتور اور خود کفیل مملکت نہ بننے پائے اور تخریبی عناصر کو حکومت کے خلاف شر انگیزی کے مواقع ملتے رہیں۔

یہ تو غنیمت ہے کہ موجودہ حکومت نے ان اجارہ داران شریعت کی شر انگیزیوں کی پرواہ کرتے ہوئے زمین پر ذاتی ملکیت کو اگر منسوخ نہیں کیا تو کم از کم ملکیت کے رقبوں کی تحدید کر کے ذاتی ملکیت کے اصول کو توڑ دیا۔ اور ملک کی آبادی کو مناسب حد کے اندر رکھنے کے لئے خاندانی منصوبہ بندی کی مہم شروع کر دی۔ ورنہ اگر وہ ان کے "فتووں" سے ڈر جاتی تو نہ معلوم اس وقت تک ملک کا کیا حشر ہو چکا ہوتا۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ منظم مذہبی پیشوائیت ہر اس مملکت کو تباہ کرنے کی سازش کرتی رہی ہے جو مملکت کا اقتدار اُس (مذہبی پیشوائیت) کے ہاتھ میں نہیں رکھنا چاہتی۔ یہی سازش اس ملک میں بھی ہو رہی ہے جس کی روک تھام نہایت ضروری ہے۔ ہم حکومت پاکستان سے درخواست کریں گے کہ وہ مملکت کے وسیع مفاد کی خاطر (i) زمین کے معاملہ میں مزید پیش قدمی کر کے (اوپر تجویز کردہ خطوط کے مطابق) کواپریٹو فارمنگ کے سسٹم کو رائج کرے — اور (ii) ملک میں آبادی کو کنٹرول میں رکھنے کے لئے مزید مؤثر اقدامات کرے۔ اس کے لئے —

(BIRTH CONTROL BY SELF CONTROL)

کا طریق سب سے زیادہ موزوں اور حکمت قرآنی کے مطابق ہے۔

یہی، ہماری بصیرت کے مطابق، خوراک کے اس مسئلہ کا مؤثر ترین حل ہے جس کے حل کے ساتھ ہماری اور بہت سی مشکلات کا حل وابستہ ہے — خدا کی زمین خدا کے بندوں کے لئے — یہ ارشاد نبوی ہے۔

— — — ⁂ — — —

خورشید عالم

اقوامِ متحدہ کا عالمی کردار

ایک عالمی سیاسی ادارے کا تصور پہلی جنگِ عظیم کے پسِ منظر سے ابھرا اور عملاً متشکل ہوا۔ "یورپ کی جنگِ عظیم" اقبالؒ کے الفاظ میں، "ایک قیامت تھی جس نے پرانی دنیا کے نظام کو ظاہر و باطن ہر پہلو سے فنا کر دیا" اور یہ موقع مہیا کیا کہ "تہذیب و تمدن کی خاکستر سے فطرت زندگی کی گہرائیوں میں ایک نیا آدم اور اس کے رہنے کے لئے ایک نئی دنیا تعمیر کرے۔ یورپ نے اقبال ہی کے الفاظ میں "اپنے علمی، اخلاقی اور اقتصادی نصب العین کے خوفناک نتائج اپنی آنکھوں سے دیکھ لئے ..... لیکن افسوس ہے کہ اس کے نکتہ رس مگر قدامت پرست مدبرین اس حیرت انگیز انقلاب کا صحیح اندازہ نہیں کر سکے جو انسانی ضمیر میں اس وقت واقع ہو رہا ہے۔ یہی عہد یورپ کا المیہ ہے۔

یورپ کے لئے جنگ بہ غایت ہیرتناک اور سبق آموز تجربہ تھا۔ اس آشوب سے اُس کی ساری زندگی تہ و بالا ہو گئی اور تصورات کا خم کدہ ویران ہو کے رہ گیا۔ ہر متحارب ملک کے سامنے ایک ہی سوال تھا اور وہ یہ کہ اپنے انسانی اور مادی وسائل کو کس طرح زیادہ سے زیادہ جنگ کے تقاضے پورے کرنے کے لئے منظم کرے۔ انفرادی آزادی، شخصی اقدام اور نجی اجارہ داری کا دلدادہ یورپ عملاً "اشتراکی" نظامِ زندگی اپنانے پر مجبور ہو گیا۔ ہر ملک میں اجتماعی زندگی پر حکومتوں کا تسلط قائم ہو گیا۔ جنگ کے یہ تقاضے بے پناہ تھے۔ اتنے بے پناہ کہ ایک عظیم ملک نے ان کے سامنے دم توڑ دیا۔ یہ ملک روس تھا جو پرانے نظام سے ایسا اکھڑا کہ دوبارہ اس پر قائم نہ ہو سکا۔ اس اعتبار سے روس نے یورپ کی اس منزل کی طرف راہنمائی کر دی جس کی طرف جنگ یورپ کو اپنے جہنم سے گزار کر لئے جا رہی تھی۔ لیکن یورپ مشیت کا حریف ہے معاون نہیں۔ اس کے مزاج کی تسکین فطرت کا راستہ روکنے میں ہے، ہموار کرنے میں نہیں۔ یورپ کی تیرہ شبی میں جنگ مژدۂ صبح لے کر آئی تو اس نے اپنی ساری روسیاہی سحر کے چہرے پر مل دی تاکہ خورشید کا نشان ڈھونڈے سے بھی کسی کو نہ مل سکے۔ امریکہ کے بارے میں ایک وقت تک یہ خوش فہمی رہی کہ وہ یورپ کے لئے بالخصوص اور دنیا کے لئے بالعموم مسیحا ثابت ہو سکے گا۔ اقبال کو بھی

یہ مغالطہ ہوا کہ "امریکہ مغربی تہذیب کے عناصر میں ایک صحیح عنصر معلوم ہوتا ہے"۔ اقبال کا خیال تھا کہ "یہ ملک قدیم روایات کی زنجیروں سے آزاد ہے اور اس کا اجتماعی وجدان نئے اثرات و افکار کو آسانی سے قبول کر سکتا ہے"۔ یہ خوش فہمی نقش برآب ثابت ہوئی۔ جب امریکہ اور یورپ کے قائدین جنگ سے پیدا شدہ صورت حال پر غور و خوض کے لئے بیٹھے تو وہ بھول گئے کہ ان کے سامنے عالمی اور انسانی مسئلہ ہے یا وہ بنی آدم کے مستقبل کے معمار ہیں۔ وہ نفرت اور انتقام کی آگ میں جلتے اور بھنتے آئے اور دنیا بھر میں اس آگ کی چنگاریاں پھیلانے کے موجب بن گئے۔ انہوں نے بزعم خود امن کا جو بیج بویا اس سے دوسری عالمی جنگ کا میوۂ تلخ حاصل ہوا۔ ایک یورپی مؤرخ کے مطابق امریکہ اور یورپ کے قائدین میں موقع کی نزاکت کا چنداں احساس نہیں تھا۔ وہ اپنی بیویوں کو بھی اپنے ساتھ پیرس لے آئے تھے۔ کیونکہ ان بیگمات کا خیال تھا کہ انہیں ایسی سیر و سیاحت کا پھر شاید موقع نہیں مل سکے گا۔ چنانچہ ۱۹۱۹ء کی مؤتمر امن کی نشست و برخاست پر ان بیویوں کی سیاحانہ تفریحات کا نمایاں اثر رہا۔

جنگ براہ راست نتیجہ تھی یورپ کے غیر مہذب تصور عمرانی کا۔ یہ دل گداز و جاں سوز حقیقت جنگ کے چار سالوں میں بخوبی آشکار ہو چکی تھی۔ مگر مؤتمر امن کے مندوبین کی سمجھ میں جنگ کی ایک ہی وجہ آسکی۔ ان کے نزدیک یہ سارا فتنہ جرمنی نے برپا کیا تھا۔ اس تشخیص کے بعد ان کا علاج بالکل واضح تھا۔ فاتح اقوام نے جرمنی کے حرم کو خوب خوب اچھالا اور اس سے جی بھر کے انتقام لیا۔ انہوں نے پورا انتظام کر لیا کہ جرمنی کو سخت ترین سزا ملے اور وہ ایسا کمر شکستہ ہو جائے کہ پھر سے سر اٹھانے کے قابل نہ رہے۔ جرمنی کا جرم ثابت کر کے اس کی سزا کا اعلان اور نفاذ کر دیا گیا تو کم نظر، پست خیال اور تعصب سراپا مدبرین مغرب ایک عالمی ادارے کے قیام میں منہمک ہو گئے تاکہ انہوں نے انسانی سطح سے گر کر جو فیصلے کئے تھے انہیں ایک بین الاقوامی مجلس کی پشت پناہی حاصل ہو جائے اور وہ بہ شدت و اکراہ تمام نافذ رہیں۔ یہ عالمی ادارہ جسے جمعیت اقوام کا نام دیا گیا، بڑے بلند بانگ دعاوی کے ساتھ معرض وجود میں لایا گیا۔ لیکن اس کی تشکیل کی حقیقی غرض و غایت اس سے زیادہ کچھ نہ تھی کہ جرمنی کو اس کے مزعومہ جرم کی جو ظالمانہ سزا دی گئی ہے وہ پوری طرح برقرار رہے اور نہ کہیں سے اس کے خلاف آواز اٹھ سکے اور نہ اس میں کسی قسم کی نرمی اور تبدیلی کی کوئی صورت ہی پیدا ہو سکے۔ اس ادارے کو عالمگیر بنانا مقصود بھی نہیں تھا اور یہ عالمگیر نہ عملاً نہ معناً بنا۔ جمعیت اقوام میں جرمنی پہلے دن سے ہی بار نہ پا سکا تھا۔ وہ مجرم تھا لہٰذا اسے شرفاء کی محفل میں بیٹھنے کے قابل ہی نہ سمجھا گیا۔ روس کو بھی تعصب ہی کی بنا پر شریک جمعیت نہ کیا گیا۔ اس نے جنگ میں یورپ کا پوری طرح ساتھ نہیں دیا تھا اور جرمنی سے لڑائی ختم کر دی تھی۔ یہی نہیں بلکہ اس نے یورپی نظام معیشت و معاشرت کو ترک کر کے اشتراکیت کو اپنا لیا تھا جس کی وجہ سے اقوام یورپ نے اسے اپنی

برادری سے خارج قرار دے دیا تھا۔ لہٰذا روس بھی منہ لگانے کے قابل نہیں رہا تھا۔ فطرت کی یہ عجیب ستم ظریفی ہے کہ امریکہ جو جمعیتِ اقوام کی تشکیل میں پیش پیش تھا دستکش ہو کے بیٹھ گیا اور اس میں سرے سے شریک ہی نہ ہوا۔ اس طرح ایسا نام نہاد عالمی ادارہ قائم ہوا جس میں جرمنی، روس اور امریکہ جیسے تین صفِ اول کے ممالک پہلے دن سے ہی شریک نہیں تھے۔ جرمنی کو کہیں ۱۹۲۶ء میں جا کے رکنیت کے قابل سمجھا گیا اور روس کو ۱۹۳۴ء میں، لیکن روس کے آتے آتے تک جرمنی اور جاپان دونوں جمعیتِ اقوام سے نکل چکے تھے۔ گویا یہ ادارہ نہ پہلے عالمی تھا نہ بعد میں عالمی بن سکا۔

جمعیتِ اقوام کی ہیئت و ترکیب میں خرابی کی جو صورت روزِ اول سے مضمر تھی، اس کا عام طور پر علم تھا۔ چنانچہ یہ یقین دہانی شروع میں ہی کر دی گئی تھی کہ ادارہ جیسا کیسا ہے اسے چلایا جائے اور عملاً جن نقائص کے ازالے کی ضرورت محسوس ہو انہیں ساتھ ساتھ رفع کر لیا جائے۔ یہ بات جہاں کہنے کی حد تک درست تھی، عملاً ناممکن ہو کے رہ گئی۔ امریکہ، روس اور جرمنی کے موجود نہ ہونے کی وجہ سے جمعیتِ اقوام برطانیہ اور فرانس کے قومی مفادات کے تحفظ ہی کا ذریعہ بن گئی۔ چونکہ ان قوموں نے جرمنی کو مجرم قرار دے کر سخت سزا دی تھی، اس لئے جمعیتِ اقوام میں انکی خصوصیت سے کوشش رہی کہ مقاصد اور عزائم، نیز طریق کار میں، کوئی ایسی تبدیلی نہ آنے دی جائے جو انتقام کی سختی اور سزا کی سنگینی میں کمی کی موجب ہو۔ چنانچہ واضح اعلانات کے باوجود جمعیتِ اقوام برطانیہ اور فرانس کے ہاتھ میں کھلونا بن کے رہ گئی۔ اس کھلونے سے کھیلنے میں اور اپنے عزائم مشئومہ کی تکمیل کے لئے ان اقوام کو امنِ عالم کا جا و بے جا دم بھرنا پڑا۔ یہ اس لئے بھی ضروری ہو گیا کہ جنگ کے خلاف ردِعمل کے طور پر ان ممالک میں امن و امان کا شدید چرچا ہونے لگا تھا۔ لیکن جہاں ان ملکوں میں اور جمعیتِ اقوام کی وساطت سے امن امن کی رٹ لگنے لگی وہاں کئی دوسرے ممالک میں جنگ کو قومی احیاء اور ترقی کا ذریعہ سمجھا جانے لگا۔ روس، جرمنی اور اٹلی میں ایسے نظام ہائے حکومت متشکل ہو گئے جو یورپ کے نظام سے مختلف بلکہ اس کے متضاد تھے۔ یہ ممالک امن کی بجائے جنگ کی باتیں کرنے لگے اور جنگ کی شد و مد سے تیاری کرنے لگے۔ ان قوموں کا یہ مزاج اور مظاہرہ جواب تھا اس جذبۂ انتقام کا جس کا بھرپور مظاہرہ فاتح اقوام نے ان سے کیا تھا۔ اس طرح یورپ اپنے ہی اعمال کی بدولت ایسی گردشِ دولابی میں گرفتار ہو گیا جس کا ہر چکر اسے نتائجِ اعمال کے گورکھ دھندے میں الجھاتا چلا گیا۔

جنگ سے جو صورتِ حال پیدا ہوئی تھی اس نے یورپی زندگی میں ہمہ گیر انقلاب کی ضرورت ناگزیر بنا دی تھی۔ یورپ نہ اسے سمجھ سکا، نہ اسے حل کرنے کے قابل ہو سکا۔ اس ناقابلیت اور نااہلیت کی بناء پر تہذیبِ یورپ اور عہدِ یورپ کا خاتمہ ہو جانا چاہیئے تھا۔ تہذیبِ یورپ تو دراصل ختم ہو چکی تھی۔ وہ اپنے ہاتھوں خودکشی کر چکی تھی اور جنگ نے اس پر مہرِ تصدیق ثبت کر دی تھی۔ لیکن کوئی تہذیب اس خلاء کو پُر نہ کر سکی اور عہدِ یورپ

کوئی زندگی اور مزید مہلت مل گئی۔ جیسا کہ پچھلے شمارے میں بیان کیا جا چکا ہے، یورپ تہذیب کا خالق یا پروردگار نہیں اس کا قائل ہے۔ اس نے دنیا کو اخلاق و اقدار کا کوئی اپنا پیمانہ نہیں دیا بلکہ اخلاق و اقدار کے رائج پیمانے چکنا چور کئے۔ اس نے تہذیبوں کو بیخ و بُن سے اکھاڑا اور ہری بھری کھیتیوں میں زہر ہی زہر بھر دیا ہے۔ زہر کی اسی فراوانی کو دیکھ کر اقبال چلا اٹھا تھا۔۔۔

من درونِ شیشہ ہائے عصرِ حاضر دیدہ ام!
آنچناں زہرے کہ از وے مارہا در پیچ و تاب

یہ انقلاب دنیا بھر میں آیا اور اس کا خمیازہ دنیا نے خصوصیت کے ساتھ جنگِ عظیم کے بعد بھگتا۔ کوئی زندہ تہذیب یورپ کی جگہ لے لیتی تو دنیا اس مسلسل عذاب سے دوچار نہ ہوتی جس سے جنگِ عظیم کے بعد دوچار ہوئی۔ اور جس کی اذیت ناکی وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتی چلی گئی اور چلی جا رہی ہے۔ آج یہ حالت ہے کہ انسان اس ہول سے سہما ہوا بیٹھا ہے کہ جانے یورپ کے اعمال کب وہ دھماکہ پیدا کر دیں جو تہذیب تو ایک طرف رہی زندگی تک کو نابود کرنے کا موجب بن جائے۔

جمعیت اقوام نہ عالمگیر ادارہ تھا، نہ اس کے عزائم مخلصانہ تھے۔ اس کے علاوہ بین الاقوامی میدان میں نہ یہ مؤثر کردار ادا کر سکتا تھا۔ اور نہ اسے ایسا کرنے ہی دیا گیا۔ اس تنظیم کی حیثیت بین الاقوامی تھی۔ بالائے قومی نہیں تھی۔ یعنی رکن قومیں قومی آزادی کے اصول کی بنا پر اس سے اپنی مرضی منوا سکتی تھیں اور اس کی مرضی کے خلاف چلنے کی مجاز تھیں۔ لیکن یہ مجلس قومی آزادی کے سامنے سپر ڈالنے پر مجبور تھی۔ از روئے منشور یہ مجلس مجبور تھی کہ قومی آزادی کو بہرحال میں مقدم سمجھے۔ نیز اس کے پاس کوئی ایسی قوت نہیں تھی جس کے زور پر یہ اپنی مرضی ارکان سے منوا سکے۔ بین الاقوامی نظم و ضبط کے لئے ضروری تھا کہ ایک بین الاقوامی فوج مرتب کی جاتی جو جارحیت کا مقابلہ کر سکتی اور دستِ تنظیم توڑ دیتی تو اسے روکے ضرور رکھتی۔ اس طرح کی فوج اس لئے مرتب نہیں ہونے دی گئی کہ اس سے رکن اقوام کی آزادی محدود ہو جائے گی۔ ان پیدائشی معذوریوں کا نتیجہ تھا کہ دیکھتے دیکھتے یہ ادارہ بے عمل اور نیم جان ہو گیا اور قومیں اس سے ہٹ کر بین الاقوامی معاہدے اور تنظیمیں بروئے کار لانے لگیں۔

جمعیت اقوام کو ۱۹۳۱ء میں ایسا امتحان پیش آیا جس نے اس کا بھرم کھول کے رکھ دیا۔ اور اگر کسی کا اس پر اعتماد باقی رہ گیا تھا تو وہ کلیتہً اٹھ گیا۔ اس سال اس کے ایک اہم رکن یعنی جاپان نے دوسرے اہم رکن یعنی چین پر باقاعدہ حملہ کر دیا۔ چین نے قدرتی طور پر جمعیت سے رجوع کیا۔ اس جمعیت نے معاملے کو ہاتھ میں تو لے لیا، لیکن جاپانی جارحیت کا اس سے کچھ مداوا نہ ہو سکا۔ یہ ایک تجربہ ہی اس کے ڈھول کا پول کھولنے کے لئے کافی تھا۔ لیکن اس کے بعد تو بین الاقوامی میدان میں ایک طوفانِ بدتمیزی بپا ہو گیا۔ اور ہر گرگ بے خوف و خطر

ہو کر معصوم بردوں کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ اٹلی ابی سینیا پر چڑھ دوڑا۔ اس نے البانیہ پر بھی قبضہ کر لیا جرمنی نے آسٹریا کو پامال کیا، پھر چیکوسلواکیہ کا صفایا کیا۔ بین الاقوامی معاہدے کاغذ کے پرزوں سے زیادہ وقیع نہ رہے اور یورپ کی قومیں درندے بن کر ایک دوسرے کو پھاڑنے اور کھانے لگ گئیں۔ چنانچہ دنیا دیکھتے دیکھتے دوسری عالمگیر جنگ کے جہنم میں پہنچ گئی اور جمعیت اقوام خاکستر ہو کے رہ گئی۔

۱۹۳۹ء کی جنگ سنہ ۱۹۱۴ء کی جنگ سے زیادہ عالمگیر اور تباہ کن ثابت ہوئی۔ یورپ کے سرتاسر ابلیسی کردار کا نتیجہ ایسی ہمہ گیر تباہی کی صورت ہی میں نکلنا چاہیئے تھا اور بالآخر نکلا۔ ابلیس کے تعویذ اس روزِ بد کو ٹال تو سکے اسے روکنے میں کامیاب نہ ہوئے۔ لیکن نہ پہلی جنگ کی قیامت یورپ کو راہِ راست پر لا سکی نہ دوسری کی۔ دونوں مواقع فطرت کی اس کاوشش کے غماز تھے کہ وہ انسان کا دستِ تعاون حاصل کر سکے اور اس کرۂ ارض کو انسانوں کے رہنے کے قابل بنائے۔

قدرت نے ۱۹۱۹ء سے لے کر ۱۹۳۹ء تک بیس سال یورپ کو مہلت دی اور اس انتظار اور کوشش میں رہی کہ وہ اپنا ہاتھ آگے بڑھائے۔ یورپ ان بیس سالوں میں سخت اذیت میں رہا۔ یہ بظاہر امن کا زمانہ دورِ جنگ سے کم کرب ناک نہ تھا۔ یورپ کا کوئی گوشہ سکون آشنا نہیں تھا۔ سارا خطہ اس آگ میں جل بھن رہا تھا جسے وہ دو صدیوں سے بھڑکاتا چلا آرہا تھا۔ اقوام یورپ کی سیاست، معیشت اور معاشرت ہمہ گیر بحران کا شکار رہیں کشمکش و اضطراب و تصادم کی یہ فصلِ خبیث کاٹے نہیں کٹتی تھی۔ پھر بھی یورپ دیوانہ وار بوئے چلا جا رہا تھا۔ جنگ نے اس کی دیوانگی کے نتائج کو جتنا نمایاں کیا، اس کی دیوانگی میں اسی قدر اضافہ ہوا۔ اس دیوانگی میں اس نے دستِ فطرت کو بار بار جھٹکا اور اپنی ہٹ پر قائم رہا۔

دوسری جنگ نے یورپ کو پیس ڈالا تھا لیکن اسے امریکہ ایسا مربی میسر آگیا جو اپنی روایتی علیحدگی پسندی ترک کر کے ایک کٹر یورپی طاقت بن کے آدھمکا۔ اس نے یہ خوش فہمی یکسر ختم کر دی کہ "امریکہ مغربی تہذیب کے عناصر میں ایک صحیح عنصر معلوم ہوتا ہے؛ وہ یورپی ذہنیت کا مظہر ہی نہیں بن گیا بلکہ اپنے عمل سے اسے کہیں زہرناک بنا دیا۔ عصری تقاضوں کا استخفاف کرنے میں اس نے قطعاً عار محسوس نہیں کی اور عالمی ادارے کا ڈھونگ رچانے میں ذرا وقت ضائع نہیں کیا۔ دوسری جنگ کے بعد معرضِ وجود میں آنے والا ادارہ "اقوام متحدہ" کہلایا۔ "جمعیت اقوام" اور "اقوامِ متحدہ" دونوں کے پیچھے ایک ہی ذہنیت کارفرما تھی اور تقریباً دونوں ایک ہی طرح کی پیدائشی معذوریاں لے کر مصروفِ کار ہوئے۔ اب بھی، پہلے کی طرح، بالادستی اقوام کو حاصل تھی، ادارے کو نہیں۔ عالمی ادارے کو نہ اس کا اختیار تھا کہ وہ قوموں پر اپنی مرضی مسلط کرے اور نہ اس کے پاس ایسا کرنے کے ذرائع ہی تھے۔ جیسے پہلا ادارہ بے دست و پا تھا، اسی طرح یہ دوسرا بھی تھا۔ ایسے

ہی ڈھونگ کی امریکہ کو ضرورت تھی۔ ایسے اداروں میں بڑی سادگی سے اخلاق و اقدار کی باتیں کی جا سکتی ہیں اور اقوامِ عالم کو ان کے حسین فریب میں الجھائے رکھا جا سکتا ہے۔ جہاں تک مصالح قومی کا تعلق ہے ڈھونگ کے لئے اور راستے کھلے تھے۔ امریکہ نے بڑی ڈھٹائی سے علاقائی معاہدات اور نام نہاد دفاعی تنظیموں کا تصور ابھارا اور اقوامِ متحدہ کے پسِ پشت ان کی ترتیب و تشکیل میں مصروف ہو گیا۔ یہ انتظامات پہلے کلیتہً روس کے خلاف تھے پھر روس اور چین دونوں کے خلاف ہو گئے اور اب بیشتر چین ہی کے خلاف ہیں۔ امریکہ نے حیلوں بہانوں سے اقوامِ متحدہ سے اس قسم کے انتظامات کے لئے سند جواز حاصل کی اور عالمی ادارے کو امریکی یا بالفاظِ واضح تر یورپی مفادات کے حصول کا آلۂ کار بنانے میں ضمیر کی خلش و ملامت کی ہلکی سی کسک تک محسوس نہیں کی۔

پہلی جنگ کے بعد عالمی ادارے میں یورپی نفرت کا نشانہ جرمنی اور روس بنے تھے۔ دوسری جنگ کے بعد پہلا نشانہ روس بنا۔ لیکن اب یورپ نے چین پر شست باندھ رکھی ہے۔ چین کو اقوامِ متحدہ کا رکن نہ بنایا گیا، نہ بننے دیا جا رہا ہے۔ امریکہ دروازے پر ڈنڈا لے کر کھڑا ہے اور چین کو اپنی جائز نشست سے محروم رکھ رہا ہے۔ اس کا کہنا یہ ہے کہ چین عالمی رائے کا احترام نہیں کرتا۔ اس لئے اسے اقوامِ متحدہ میں شامل نہیں کرنا چاہیئے۔ بغرضِ استدلال اسے تسلیم کر لیا جائے کہ چین عالمی رائے کا احترام ضروری نہیں سمجھتا۔ تو اس سے یہ نتیجہ نکلنا چاہیئے کہ چین کو بہلا پھسلا کر عالمی ادارے میں لے آنا چاہیئے تاکہ عالمی برادری کے دباؤ سے اسے عالمی رائے کا پابند بنایا جا سکے۔ اگر اس بنا پر چین کو اقوامِ متحدہ سے باہر رکھا جا سکتا ہے، تو اسی بنا پر بھارت، اسرائیل، جنوبی افریقہ، روڈیشیا جیسے نافرمان اور بدتمیز ارکان کو خارج کر دینا چاہیئے۔ وہ مسلسل عالمی ادارے کے فیصلوں کی توہین کرتے چلے آ رہے ہیں۔ لیکن چونکہ یہ ممالک یورپی حلقہ بگوش ہیں اس لئے ان کی گوشمالی کرنے کی بجائے ان کی پیٹھ ٹھونکی جاتی ہے۔ ایک کشمیر کا مسئلہ یہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ اقوامِ متحدہ کتنا بے کار بلکہ خطرناک ادارہ ہے۔ اور امریکہ کے نزدیک اس کا استعمال کیا ہے۔ اقوامِ متحدہ نے ۱۹۴۸ء میں یہ فیصلہ کیا تھا کہ اہلِ کشمیر بین الاقوامی استصواب کے ذریعہ طے کریں کہ انہیں پاکستان سے الحاق کرنا ہے یا بھارت سے۔ تمام ارکان کا یہ فرض ہونا چاہیئے تھا کہ ایسے حالات پیدا کئے جائیں کہ اس کی تعمیل ہو سکے۔ امریکہ نے ایسا نہیں ہونے دیا۔ اس کی اکثر کوشش رہی کہ یہ معاملہ بار بار اقوامِ متحدہ میں نہ اٹھایا جائے۔ کیونکہ وہ نہیں چاہتا کہ اپنے حلقہ بگوش بھارت کو عالمی سطح پر پریشان کرے۔ اس فیصلے کے ظلِ الغیم وہ کہتا ہے کہ کشمیر کا قضیہ پاکستان اور بھارت کو باہمی طور پر طے کرنا چاہیئے۔ دوسرے الفاظ میں وہ پاکستان کو یہ کہہ رہا ہے کہ وہ اقوامِ متحدہ سے کسی قسم کا حسنِ ظن نہ رکھے اور اس کی طرف دیکھنا چھوڑ دے اور بھارت

کو یہ کہہ رہا ہے کہ وہ بے فکر ہو کر اپنا غاصبانہ قبضہ برقرار رکھے اور اقوامِ متحدہ کے فیصلوں کو خاطر میں نہ لائے۔ اس حکمتِ عملی کا کشمیر، پاکستان اور بھارت پر جو اثر پڑا، وہ علیحدہ مبحث ہے۔ لیکن اس نے اقوامِ متحدہ، ــــ اور امریکہ ــ کی قلعی کھول دی۔

امریکہ ڈنڈا لے کر اقوامِ متحدہ کے دروازے پر ہی کھڑا نہیں، وہ اپنی لاٹھی لئے دنیا بھر کی بھینسیں ہانکے چلا جا رہا ہے۔ بحر اوقیانوس میں اسکے اڈے ہیں۔ برطانیہ میں اس کے اڈے ہیں، مغربی یورپ میں اس کے اڈے ہیں، بحیرہ روم میں اس کا بیڑہ ہے۔ عدن اور جنوبی عرب میں برطانیہ کے اڈے ہیں۔ نام نہاد بحرِ ہند میں اس کا بیڑہ ہے۔ اس سمندر میں برطانیہ اس کے لئے مزید اڈے قائم کر رہا ہے۔ بھارت کے بعض جزائر تک اس کی دسترس ہے۔ سنگاپور میں برطانیہ کا اڈہ ہے۔ جنوبی ویت نام، تھائی لینڈ وغیرہ میں امریکہ کے اڈے ہیں۔ جنوبی چینی سمندر میں امریکہ کا بیڑہ ہے۔ جاپان میں امریکہ کے اڈے ہیں۔ بحرالکاہل میں سینکڑوں جزیرے اس کے اڈے ہیں۔ اس کے خلائی جہاز فضائے افلاک میں اس سے بھی خار و زبوں ہیں کہ ٹکٹکی باندھ کے دیکھتے رہیں کہ چین اپنے ہاں کیا کر رہا ہے۔ امریکہ کا تصور تو عرش پر ہے لیکن سر پائے چین پر ہے۔ وہ بلندی مشین کی ہے، یہ پستی یورپ کی ہے۔ اقوامِ متحدہ ان دو پاٹوں میں پس رہی ہے۔ اقبال نے بڑا صحیح کہا تھا کہ ــــ

چہرہ روشن اندروں چنگیز سے تاریک تر!

ــ افرنگ کی ظاہری تابناکی خیرہ کن ہے لیکن یہ دل کا نور نہیں، بجلی کے چراغوں کی ہے۔ انسان کے مرضِ کہن کا چارہ دل کا نور ہے، بجلی کا چراغ نہیں۔ اس چراغ کی روشنی میں جو تیلم پری نظر آتی ہے وہ پرتو ہے اس دیوِ استبداد یورپ کا جو اس کے پس پردہ پائے کوب ہے۔ جمعیت اقوام اور اقوامِ متحدہ وہ خوشنما پردے ہیں جو دیو کو ڈھانپے رکھتے ہیں۔ دستِ فطرت آہستہ آہستہ ان پردوں کو چاک کرنے کے سامان کر رہا ہے مستقبل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے والے دامنِ یورپ کو نمایاں طور پر تار تار دیکھیں گے۔

اس آنے والے دور کی جھلک ایک حد تک بعض پچھلے مضامین میں دکھائی جا چکی ہے اور ایک حد تک آئندہ مضامین میں دکھائی جائے گی۔ انشاء اللہ!

آئندہ شمارہ میں
یومِ اقبالؒ کی تقریب پر پرویز صاحب کا خطاب ــ "اے کشتۂ سلطانی و ملائی و پیری"
شائع ہوگا!

ابوشہاب رفیع اللہ

مجموعۂ قوانینِ اسلام[1] پر ایک نظر

[ادارۂ تحقیقات اسلامیہ (اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ) کی طرف سے ایک کتاب "مجموعہ قوانینِ اسلام" شائع ہوئی تھی جس پر طلوعِ اسلام کی مئی ۱۹۶۶ء کی اشاعت میں تبصرہ کیا گیا تھا۔ اس تبصرہ میں ہم نے بتایا تھا، کہ جو قوانین اس میں پیش کئے گئے ہیں ان میں سے بیشتر ایسے ہیں جو قرآنِ کریم کے صریحاً خلاف ہیں۔ اب محترم ابوشہاب صاحب نے اس کتاب پر تفصیلی تبصرہ سے یہ واضح کیا ہے کہ (قرآن کے خلاف ہونا تو ایک طرف) اس مجموعہ میں ایسے قوانین ہیں جو احادیث کے بھی خلاف ہیں اور فقہ کے بھی۔

ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی نے اس مجموعہ کو یہ کہہ کر شائع کیا ہے کہ اس سے مقصود یہ ہے کہ قانون سازی کے سلسلہ میں حکومت کو رہنمائی حاصل ہو۔ اب ظاہر ہے کہ جس کتاب کی کیفیت یہ ہو اس سے حکومت کو راہنمائی حاصل ہوگی یا وہ ہر گوشے میں الٹے راستے پر جا پڑے گی،

ہم اس تبصرہ کو اس مقصد کے لئے بھی شائع کر رہے ہیں کہ قارئین پر یہ حقیقت اور بھی زیادہ واضح ہو جائے کہ ہمارے مروجہ قوانینِ شریعت (خواہ وہ احادیث پر مبنی قرار دیئے جائیں یا فقہ پر) کس قدر الجھاؤ پیدا کرتے ہیں۔ اس لئے جب تک قانون سازی کے سلسلہ میں خالص قرآنِ کریم کو بنیاد قرار نہیں دیا جائے گا، پاکستان میں اسلامی قوانین مرتب نہیں ہو سکیں گے۔ (طلوعِ اسلام)]

پچھلے چند سالوں سے ہمارے ملک میں اسلامی قانون کی جدید تدوین و ترتیب کے متعلق بہت کچھ کہا اور لکھا جا رہا ہے لیکن بدقسمتی سے بعض ایسی وجوہات کی بنا پر جن کی تفصیل میں جانے کی مجھے ضرورت نہیں یہ مسئلہ کچھ پیچیدہ سا ہو گیا ہے جس کی وجہ سے ابھی تک اس سلسلے میں کوئی ٹھوس کام نہیں ہو سکا۔ بلکہ

---

[1] از جناب تنزیل الرحمٰن صاحب ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی۔ ایڈووکیٹ۔ شائع کردہ۔ ادارہ تحقیقاتِ اسلامی راولپنڈی

اہل علم کی تو سمجھ میں نہیں آتا، کہ کون سی راہ اختیار کی جائے۔ کیونکہ اگر قرآن وسنت کے مطابق قانون سازی ہو تو یہ اعتراض اٹھایا جاتا ہے کہ ایسا اقدام حنفی فقہ کے خلاف ہے۔ (یہ دلچسپ بحث آگے آئے گی) اور اگر کوئی اقدام جزئیات کی حد تک حنفی فقہ کے عین مطابق ہو تو پھر بھی اس کی مخالفت کی جاتی ہے۔ حتیٰ کہ اگر کسی معاملہ کے متعلق وہی کچھ کہا جائے جو کچھ یہ مخالفین حضرات اس سے پیشتر خود کہتے چلے آرہے تھے، تو بھی ان کی طرف سے مخالفت ہوتی ہے۔ لہٰذا جب کسی مسئلہ کی موافقت یا مخالفت میں یہ روش اختیار کی جائے تو ظاہر ہے کہ ملک میں اسلامی قوانین مرتب کیسے ہو سکتے ہیں۔

مقام شکر ہے کہ مجموعہ زیر بحث ہر قسم کی مصلحت کوشیوں سے بالاتر ہو کر اسلامی قوانین کی جدید ترتیب و تدوین کی ایک اہم کوشش ہے۔ اور اس طرح اسلامی قوانین کو زمانہ جدید کے تقاضوں کے مطابق مدون کرنے کی داغ بیل ضرور ڈال دی گئی ہے۔ یہ کام خاصا لمبا اور سخت محنت طلب ہے اور اس سلسلے کی پہلی کڑی جو قانون ازدواج پر مشتمل ہے، ہمارے سامنے ہے۔ فقہی ابواب کے برعکس، قانونِ ازدواج کو سب سے پہلے پیش کرنے کے لئے شاید اس لئے منتخب کیا گیا ہے کہ آجکل یہ ایک زندہ موضوع ہے اور اس پر کافی بحث ہو رہی ہے۔

اس مجموعہ کے شروع میں کچھ عمدہ اصول مقرر کئے گئے ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ حتی الوسع انہی چیزوں کو اختیار کیا جائے گا جن کی سند قرآن وحدیث سے ملتی ہو یا کم از کم اس کے زیادہ قریب ہوں۔ اور صاحب مصنف نے یہ دعویٰ بھی کیا ہے کہ قانونی احکام ومسائل قرآن وسنت سے براہ راست مستنبط کئے گئے ہیں (صفحہ ۲۵) اور یہ کہ اس سلسلے میں انہیں بے جا قدامت پسندی اور روایت پرستی سے جنگ لڑنی پڑی ہے (صفحہ ۲۰) آئندہ اوراق میں ہم یہ دیکھنے کی کوشش کریں گے کہ فاضل مصنف کا یہ دعوےٰ کہاں تک صحیح ہے اور یہ کہ کس میدان میں انہوں نے بے جا قدامت پسندی سے کس قسم کی جنگ لڑی ہے۔ اس مختصر سے تجزیئے میں ہم صرف ان اہم مسائل کو لیں گے جن کا ہمارے معاشرہ پر گہرا اثر پڑتا ہے۔ اور جن میں سے بعض کی اصلاح عائلی قوانین کے ذریعہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

انعقاد اور جواز نکاح۔۔۔ دفعہ ۵ کے تحت یہ قانون مرتب کیا گیا ہے کہ ہر عاقل و بالغ مسلمان مرد و عورت بلا وساطت ولی نکاح کی اہل ہے[1]

---

[1] مجموعہ قوانین اسلام۔ جلد ۱۔ صفحہ ۵۷

اس مسئلہ سے متعلق تفصیلی بحث کرنے سے پہلے اس حقیقت کی طرف اشارہ کر دینا ضروری ہے کہ امتِ مسلمہ کے جمہور فقہاء کا مسلک اس کے بالکل برعکس ہے۔ یعنی ان کے نزدیک کنواری لڑکی (باکرہ) ولی کے بغیر نکاح کرانے کی اہل نہیں[1] اور جمہور علماء کا یہ مسلک ان چند اہم فقہی مسائل میں سے ہے جن پر صحابہ کرام کا اجماع ہے۔ علامہ شوکانی فرماتے ہیں :-

> وَقَدْ ذَهَبَ إِلَىٰ هٰذَا علی وعمر و ابن عباس و ابن عمر و ابن مسعود و ابوهريرة و عائشة و الحسن البصري و ابن المسيب و ابن شبرمة و ابن ابي ليلى و العترة و احمد و اسحٰق و الشافعی و جمهور اهل العلم فقالوا لا يصح العقد بدون ولی۔ قَالَ ابن المنذر انّه لَا يُعْرَف عَنْ اَحَدٍ مِنَ الصحابة خلاف ذالك[2]
>
> حضرت علیؓ، حضرت عمرؓ، حضرت ابن عباسؓ، حضرت ابن عمرؓ، حضرت ابن مسعودؓ حضرت ابوہریرہؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت حسن البصریؒ، ابن المسیب۔ امام ابن شبرمہ، امام ابن ابی لیلےٰ، ائمہ اہلِ بیت، امام احمد، امام اسحاق، امام شافعی اور جمہور اہلِ علم کا یہ مسلک ہے کہ ولی کے بغیر نکاح صحیح نہیں ہے۔ ابن منذر کا کہنا ہے کہ اس مسلک میں اجماعِ صحابہ ہے۔

ہمارے فقہی سرمایہ میں اجماع کی اگر کوئی حقیقی صورت ہے تو وہ اجماعِ صحابہ کرامؓ ہے۔ کیونکہ یہ لازمی امر ہے کہ انہوں نے قرآنی احکام اور منشا نبویؐ کو صحیح طور پر سمجھا ہوگا۔ چنانچہ صحابہؓ کا یہ اجماع اس موضوع سے متعلق احادیث کی صحت کی ایک دلیل ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ خود حنفی فقہاء میں اس مسئلہ پر اتنا اختلاف ہے کہ شاید ہی کسی مسئلہ پر ہوا ور ہمیں بہت سے ایسے اقوال ملتے ہیں جن سے جمہور اہلِ علم کے مسلک کی تائید ہوتی ہے۔ بلکہ اکثر اجل حنفی ائمہ اس پر عمل بھی کرتے رہے ہیں۔ اس بارے میں اگر کسی پہلو میں ان کا اتفاق ہے تو اس پر کہ بغیر ولی کے نکاح خلاف مستحب ضرور ہے۔ اِنَّهٗ خلاف مستحب[3] علامہ ابن ہمام احناف کے اختلاف کو ان الفاظ

---

[1] یہ مسلک قرآن کیخلاف ہے۔ قرآن کی رُو سے نابالغ کا نکاح ہو نہیں سکتا اور بالغ لڑکے یا لڑکی کو نکاح کیلئے ولی یا وکیل کی ضرورت نہیں۔ (طلوعِ اسلام)

[2] نیل الاوطار شرح منتقی الاخبار جلد ۶ صفحہ ۱۲۸۔ طبع قاہرہ ۱۹۶۱ء

[3] شرح فتح القدیر۔ جلد ۲۔ صفحہ ۳۹۱ مطبوعہ مصر۔

میں بیان کرتے ہیں۔

وکثرۃ الروایات عن الاصحاب فیہ و اختلافھا وحاصل ماعن علمائنا رحمھم فی ذالک سبع روایات[1]

اس بارے میں ائمہ احناف سے کثیر روایات اور گہرے اختلافات منقول ہیں اور یہ کہ اس بارے میں ان میں اختلاف تھا۔ مختصر یہ کہ ہمارے علماء سے اس بارے میں سات روایات منقول ہیں۔

امام ابو یوسف کا تو مسلک ہی وہی تھا جو جمہور کا ہے :-

وعن ابی یوسف رحمۃ اللہ علیہ انہ لا ینعقد الا بولی و عند محمد ینعقد موقوفا[2]

امام ابو یوسف کے نزدیک ولی کے بغیر نکاح کا انعقاد نہیں ہو سکتا اور امام محمد کے نزدیک منعقد تو ہو جاتا ہے لیکن ولی کی اجازت پر موقوف ہے۔

امام ابو یوسف سے دوسرا اختلافی مسلک بھی نقل کیا جاتا ہے لیکن امام طحاوی اور امام کرخی کا فیصلہ یہ ہے کہ یہی ان کا آخری اور مرجع الیہ قول ہے :-

ذکرہ الطحاوی من ان قولہ المرجوع الیہ عدم الجواز الا بولی وکذا الکرخی فی مختصرہ حیث قال و قال ابو یوسف لا یجوز الا بولی وھو قولہ الاخیر۔[3]

امام طحاوی نے ذکر کیا ہے کہ امام ابو یوسف کا مرجوع الیہ قول یہ ہے کہ ولی کے بغیر نکاح جائز نہیں اور امام کرخی نے بھی اپنی مختصر میں یہی کچھ لکھا ہے جب وہ فرماتے ہیں کہ امام ابو یوسف کا فرمانا یہ ہے کہ ولی کے بغیر نکاح نہیں ہے۔ اور یہی ان کا آخری قول ہے۔

اب دیکھئے کہ حنفی فقہاء احادیث کا جواب کس طرح دیتے ہیں۔ ان میں ایک حدیث جو حضرت عائشہ رضؓ سے مروی

---

[1] شرح فتح القدیر جلد ۲ صفحہ ۳۹۱ ۔ مطبوعہ مصر۔

[2] ہدایہ مع شرح فتح القدیر جلد ۲ ۔ صفحہ ۳۹۱ ۔

[3] شرح فتح القدیر جلد ۲ صفحہ ۳۹۱

ہے اور جسے مصنف نے صفحہ ۷۰ پر نقل کیا ہے کہ جو عورت ولی کی اجازت کے بغیر نکاح کرے تو وہ نکاح باطل ہے۔ باطل ہے، باطل ہے۔ خیال رہے کہ یہ حدیث ائمہ حدیث کے نزدیک صحیح ہے اور اسی تصریح کے ساتھ ترمذی، ابوداؤد اور ابن ماجہ میں موجود ہے[1]

حنفی فقہاء نے اس مفہوم کی دوسری حدیثوں کو ضعیف ثابت کرنے میں ایڑی چوٹی کا زور لگایا ہے لیکن خود ان کی اپنی تسلی نہ ہوئی اور آخر کار ان کو یہ کہنا پڑا :-

وَيُخَصُّ حديث عائشة بِمَنْ نَكَحَتْ غَيْرَ الكفء[2]

حضرت عائشہؓ کی حدیث اس لڑکی کے نکاح سے مخصوص سمجھی جائے گی جو غیر کفو میں نکاح کرے۔

یہ کفو والا بھی عجیب مسئلہ ہے۔ اس کی مفصل بحث آگے آئے گی۔ تاہم مدینہ شریف میں جو پہلی اسلامی سوسائٹی تشکیل پذیر ہوئی تھی، اس میں ان باتوں کا مطلق خیال نہیں کیا جاتا تھا۔ صرف اسلام ہی کفو یعنی ہمسری کا معیار مقصود ہوتا تھا۔ قرآن مجید میں حضرت زیدؓ کی شادی کے واقعہ کا ذکر اس امر کی زبردست دلیل ہے ولی کی عدم موجودگی میں نکاح کے نہ ہونے کے بارے میں احادیث کا جواب جس طرح حنفی فقہاء نے دیا ہے وہ بڑا ہی دلچسپ ہے اس کی تفصیلات ملاحظہ ہوں :-

وَ أَمَّا الحديث المذكور وما بمعناه من الاحاديث فمعارضة بقوله صلى الله عليه وسلم الأَيِّمُ أَحَقُّ بِنَفْسِهَا من وليها رواه مسلم وابوداؤد و الترمذي والنسائي ومالك في الموطاء[3]

حضرت عائشہؓ کی مذکور حدیث اور اس مفہوم کی جو دوسری احادیث ہیں ان کے کمزور ہونے کی دلیل یہ ہے کہ وہ اس فرمان نبوی سے ٹکراتی ہیں کہ الایم (خاوند دیکھی عورت) ولی کی نسبت اپنے نفس کی زیادہ حقدار ہے۔

حنفی فقہاء نے اس حدیث کا دوسرا ٹکڑا جس سے "الایم" کے معنی متعین ہوتے ہیں، نقل نہیں فرمایا اور ابی عبیدہ کی کتاب الامثال کا حوالہ دے کر یہ ثابت کر دیا کہ "الایم" کے مفہوم میں باکرہ (کنواری لڑکی) بھی شامل ہے۔ یہ لفظ اس حدیث میں اگر باکرہ کے مقابلہ میں نہ ہوتا تو ہم ان حضرات کی کوششوں کی ضرور داد دیتے۔ حدیث کا دوسرا ٹکڑا یوں ہے۔ والبكر تستأذن في نفسها و اِذْنُهَا صُمَاتُهَا۔ اور کنواری

---

[1] شرح فتح القدیر جلد ۲۔ صفحہ ۳۹۲ - [2] ایضاً ۳۹۳ [3] ایضاً۔ صفحہ ۳۹۲

لڑکی سے شادی کی اجازت لی جائے اور اس کی خاموشی اجازت پر دلالت کرتی ہے۔ علامہ ابن ہمام نے اوپر حدیث کی جن کتابوں کا ذکر کیا ہے۔ ان تمام میں یہ ٹکڑا موجود ہے۔ امام نووی اس لفظ کی تشریح یوں فرماتے ہیں :۔

قال النووی المرادُ ھُنَا الثیبُ لِاَنّہٗ جاءَ مفسراً [۱]

امام نووی فرماتے ہیں کہ یہاں "الایم" سے مراد خاوند دیکھی عورت ہے۔ کیونکہ خود اس کی تفسیر ساتھ ہی موجود ہے۔

لغت میں اس کے معنی یوں کئے جاتے ہیں۔

اَیِّم الرَّجُلُ مِنْ زَوْجَتِہٖ والمرأۃُ مِنْ زَوْجِھَا فقدھا او فقدتہٗ ھو وھی آئمٌ۔ [۲]

ایم کا مطلب یہ ہے کہ زوجین میں سے کوئی ایک دوسرے کو کھو دے۔

ہمارے فاضل مصنف نے قدامت پسندی سے جنگ کرتے ہوئے اس سے بھی زیادہ دلچسپ طرزِ عمل اختیار کیا ہے۔ کتاب کے حاشیہ میں حدیث تو مکمل نقل کر دی لیکن اوپر جہاں مطلب بیان فرمایا ہے اس ٹکڑے کے ترجمے کو جو ان کی دلیل کے خلاف دلیل ہے، بالکل ہضم کر گئے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب کچھ دانستہ کیا گیا ہے کیونکہ حدیث کے آخری ٹکڑہ کی موجودگی میں" الایم" کا صرف ایک ہی مفہوم یعنی خاوند دیکھی عورت بنتا ہے۔ اور حدیث زیر بحث میں اس مفہوم کی مطلق کوئی گنجائش ہی نہیں رہتی جو یہ حضرات اس لفظ کو پہنانا چاہتے ہیں۔

مصنف نے بہت سے مقامات پر اسلامی احکامات کی تائید میں اعلیٰ عدالتوں کے فیصلے نقل کئے ہیں جن کی ضرورت شاید اتنی شدید نہ تھی جتنی کہ اس مسئلہ میں، اگر وہ کچھ نظریں پیش فرما دیتے کہ ہمارے معاشرہ میں اس" دفعہ" کا کتنا ناجائز فائدہ اٹھایا جاتا رہا ہے اور کتنی نوجوان لڑکیاں بے سمجھی میں گھروں سے بھاگ کھڑی ہوئیں اور شریف والدین کی عزت کو خاک میں ملا دیا۔ اور اس دفعہ کا ناجائز فائدہ اٹھانے والوں نے ان کی ایک نہ چلنے دی۔

شہادتِ نکاح

دفعہ ۱۶ میں گواہوں کے سلسلے میں امام مالک کے نقطۂ نظر کو غلط انداز سے

---

[۱] تنویر الحوالک جلد ۲ صفحہ ۳۔ مطبوعہ قاہرہ۔ [۲] المنجد

پیش کیا گیا ہے۔ فاضل مصنف کے بیان سے یہ تاثر قائم ہوتا ہے کہ شاید امام مالک کے نزدیک نکاح شادی کے لئے گواہوں کی کوئی ضرورت نہیں صرف اعلان ہی کافی ہے حالانکہ یہ تصور بالکل غلط ہے۔ امام مالک کے نزدیک کوئی بھی شادی جو گواہوں کے بغیر اختتام پذیر ہو تو ایسا نکاح خود بخود فسخ ہو جائے گا اور اس کے مرتکب زوجین پر حد زنا جاری ہوگی۔ فرق صرف یہ ہے کہ ان کے نزدیک اس کی پابندی رخصتی کے وقت لازم ہے نہ کہ صرف عقد کے وقت۔ عقد کی تشہیر کے لئے صرف اعلان ہی کافی ہے۔ امام مالک کا مسلک عام طور پر ان الفاظ میں بیان کیا جاتا ہے۔

أَمَّا الشَّهَادَةُ فَقَدْ عَرَفْتَ أَنَّهَا ضَرُورِيَّةٌ لابد مِنْهَا ولكن لَا يَلْزَمُ أَنْ يَحْضُرَ الشهود عند العَقْدِ بَلْ يُنْدَبُ ذَالِكَ فقط ...... فاذا قال الولي زوجتك فلانةً وقَالَ الزوجُ قبلتُ انْعَقَدَ النكاح وَإِنْ لَمْ يَحْضُرْ احَدٌ وَلٰكِنْ يَجِبُ أَنْ يحضر شاهدان عند الدخول بها فان دَخَلَ عليها من غير شاهدين فسخ النكاح وكان عليهما حد الزنا ۔؎

جیسا کہ معلوم ہوا کہ گواہ نکاح شادی کے لئے لازمی ہیں لیکن عقد کے وقت ان کا موجود ہونا فرض نہیں مستحب ہے۔ جب ولی کے ذریعہ ایجاب وقبول ہو تو نکاح کا انعقاد ہو جاتا ہے چاہے کوئی بھی حاضر نہ ہو۔ لیکن رخصتی کے وقت دو گواہوں کا ہونا لازمی ہے ورنہ نکاح فسخ ہوگا اور ان دونوں پر حد نکاح ہوگی۔

نکاح کی رجسٹری

دفعہ ۱۷ (۱) عائلی قانون کے بموجب عمل میں لایا ہوا ہر نکاح درج رجسٹر کیا جائے گا

ان الفاظ سے یہ غلط فہمی پیدا ہوتی ہے کہ نکاح میں دو عملی کی گنجائش ہے اور کچھ ایسے نکاح بھی ہیں جن کی رجسٹری کی ضرورت نہیں۔ اس غلط فہمی کو دور کرنے کی ضرورت ہے۔

ہمارے ہاں کے مروجہ نکاحوں میں اکثر حالتوں میں مہر مؤجل ہوتا ہے جو فقہا کی تصریحات کے مطابق خاوند کے ذمہ قرض ہوتا ہے۔ ہدایہ میں ہے ـــ فَلِاَنَّ المسمّیٰ دَیْنٌ فی ذمتہ۔ (کہ مہر خاوند کے ذمہ

؎ الفقہ علی المذاہب الاربعہ ۔ جلد ۴ صفحہ ۲۳

قرضہ ہے) جو خاوند کی موت کے بعد اس کے ورثاء سے وصول کیا جا سکتا ہے۔ ہمارے فقہاء نے شہادت نکاح کا استنباط قرض کے بارے قرآنی احکام سے کیا ہے تو یقیناً انہی قرض والے قرآنی احکام کو سامنے رکھ کر نکاح کی کتابت اور رجسٹری کے بارے میں بھی استدلال کیا جا سکتا ہے۔

تعدد ازدواج اور دوسری شادی کیلئے بیوی کی اجازت

فاضل مصنف دفعہ ۱۸ کے تحت مندرجہ ذیل تجویز فرماتے ہیں ۔

> پاکستان کے نافذ الوقت قانون میں ایک بیوی کی موجودگی میں دوسرے نکاح کی اجازت کے حصول کے لئے موجودہ زوجہ کی مرضی غیر منطقی اور غیر حقیقی ہے۔ اس کو حذف کر دینا چاہیئے۔ (صفحہ ۱۴۳)

باوجود بار بار پڑھنے کے مجھے اس تجویز کے حق میں فاضل مصنف کی کوئی دلیل نہیں مل سکی۔ حالانکہ اگر سنت نبوی کو سامنے رکھا جاتا تو معلوم ہو جاتا کہ ایسا کرنا نہ صرف منطقی اور حقیقی ہے بلکہ سنت ہے۔ ایک حدیث ملاحظہ ہو جو امام بخاری باب ذب الرجل عن ابنتہ فی الغیرۃ والانصاف (غیرت اور انصاف کے بارے میں انسان کا اپنی بیٹی کی طرف سے مدافعت کرنا) کے تحت لائے ہیں ۔

> عَنِ المسور بن مَخرمۃ قَالَ سَمِعتُ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم یقولُ وھو علی المنبر انّ بنی ھشام بن المغیرۃ استاذنوا فی ان ینکحوا ابنتھم علی بن ابی طالب فلا اٰذنُ ثمّ لا اٰذنُ الّا انْ یرید ابن ابی طالب انْ یطلق ابنتی و ینکح ابنتھم فانّما ھی بضعۃ منّی یریبنی ما ارابھا و یؤذینی ما اٰذاھا۔ [1]

> مسور بن مخرمۃ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ میں نے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو منبر پر یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ بنی ہشام بن مغیرہ نے مجھ سے اجازت چاہی ہے کہ وہ اپنی بیٹی کی شادی حضرت علی ؓ سے کر دیں۔ پس میں اجازت نہیں دیتا، کوئی اجازت نہیں، کوئی اجازت نہیں۔ ہاں اگر ابو طالب کا بیٹا شادی کرنا چاہتا ہے تو میری بیٹی کو طلاق دے دے اور ان کی بیٹی سے نکاح کر لے حضرت

---

[1] بخاری شریف کتاب النکاح جلد دوم۔

فاطمہؓ میرا جگر گوشہ ہے جو چیز اسے تکلیف پہنچاتی ہے وہ مجھے بھی تکلیف پہنچاتی ہے
اور جو اسے ایذا دیتی ہے وہ مجھے بھی ایذا دیتی ہے"

اس حدیث سے مندرجہ ذیل باتیں ثابت ہوتی ہیں :-

(۱) دوسری شادی کے لئے نبی صلے اللہ علیہ وسلم سے اجازت مانگی گئی۔

(۲) آپؐ نے اپنے فیصلے کا اعلان منبر پر فرمایا جس سے معلوم ہوا کہ آپ امت کو اسکی تعلیم دے رہے تھے۔

(۳) دوسری شادی سے حضرت فاطمۃ الزہراؓ کو ایذا پہنچی۔ معلوم ہوا کہ عام حالات میں دوسرے نکاح سے پہلی بیوی کو ایذا پہنچنا ایک طبعی امر ہے۔ اگر اس وجہ سے پہلی بیوی یا اس کے متعلقین نکاح سے مانع ہوں تو وہ حق بجانب ہیں۔

(۴) جس طرح حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو اپنی بیٹی پر سوکن آنے سے تکلیف ہو سکتی تھی، اسی طرح ہر باپ کو تکلیف ہو سکتی ہے۔ اور جس طرح نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ برداشت نہیں کیا کہ ان کی بیٹی پر سوکن آئے اسی طرح ہر والد کے لئے یہ چیز ناقابل برداشت ہے۔

(۵) رسولِ خدا صلے اللہ علیہ وسلم کی ایک حیثیت امیر المومنین کی بھی تھی۔ اس سے ثابت ہوا کہ حکومت بھی دوسری شادی کے معاملہ میں دخل دے سکتی ہے

حقیقت یہ ہے کہ یہ حدیث نہ صرف دوسری شادی کے لئے پہلی بیوی کی اجازت لینے کے بارے میں ایک زبردست دلیل ہے، بلکہ تعدد ازدواج کے سلسلے میں جتنے اعتراضات کئے جاتے ہیں ان کا تسلی بخش جواب بھی ہے۔ تاہم ذرا آگے چل کر فاضل مصنف کے بقیہ دلائل پر ایک نظر ڈالنے میں کیا حرج ہے۔

دفعہ ۲۵ میں فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِنَ النِّسَاءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ .... کے تحت فرماتے ہیں۔

"تمام ائمہ اس پر متفق ہیں کہ اسلام میں بیک وقت چار عورتوں کو نکاح میں رکھنے کی اجازت ہے۔ (صفحہ ۱۸۱)

اس متفقہ فیصلہ کی فاضل مصنف نے کوئی دلیل نہیں دی۔ اور نہ ہی یہ وضاحت فرمائی کہ ائمہ سے کون سے ائمہ مراد ہیں۔ ائمہ تفسیر، یا ائمہ حدیث یا ائمہ فقہ ـــ اور صورتِ حالات یہ ہے کہ ان تینوں علوم کے ائمہ کے درمیان اس بارے میں زبردست اختلاف پایا جاتا ہے۔ اس کی ایک جھلک آپ بھی ملاحظہ فرمائیں۔ ائمہ اہل الظاہر، امام ابن الصباغ عمرانی اور شیعہ کے بعض ائمہ چار کی قید کو تسلیم نہیں کرتے۔ اور وہ اس آیت کی تفسیر یوں فرماتے ہیں ـــ (یہاں لمبی عربی عبارت نقل کرنے کی بجائے صرف ترجمہ پر اکتفا کیا جاتا ہے)۔

"اس آیت میں مَثْنٰی ، و ثُلٰثَ و رُبَاعَ کے درمیان" واو "جمع کے لئے ہے (یہ اہل ظاہر کا مسلک ہے ان کے نزدیک نو بیویوں تک کی اجازت ہے) لغت میں لفظ مثنیٰ کے معنے "دو" "دو" کے ہیں، نہ کہ صرف دو اور اگر کہا جائے کہ دو دو آدمی آئے تو یہ الفاظ ایک ہزار کی تعداد میں آنے والے اشخاص کے لئے بھی بولے جا سکتے ہیں کہ اتنی تعداد دو دو کر کے آئی۔ مثلاً کہا جاتا ہے کہ جاء القوم مثنیٰ (لوگ دو دو کر کے آئے) ثلٰث اور رُبَاعَ کے معنی بھی اسی طرح ہوں گے۔ یہ عربی لغت کا مسئلہ ہے جس میں شک کی کوئی گنجائش نہیں۔ پس آیت مذکور اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ "دو" "دو" یا "تین" "تین" یا "چار" "چار" سے شادی کرے۔ اس میں یہ شرط نہیں کہ اس کے بعد اتنی تعداد کی دوسری جماعت نہ ہو۔ کیونکہ لغت اور عرف کے لحاظ سے یہ شرط ٹھیک نہیں مثلاً اگر کسی آدمی کے پاس ایک ہزار آدمی جمع ہوں تو وہ کہہ سکتا ہے کہ یہ لوگ دو دو یا تین تین کر کے آئے۔ اس حساب سے لاتعداد شادیاں جائز ہیں۔ اب داؤ چاہے جمع کے لئے ہو یا اختیار کے لئے، کوئی فرق نہیں پڑتا۔"[1]

ائمہ تفسیر نے اس طرز استدلال کو نہ صرف تسلیم کیا ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ تفصیل سے اپنی تفاسیر میں اسے بیان کیا ہے۔ تفصیلی بحث۔ کے لئے ملاحظہ ہو تفسیر کبیر جلد ۳، صفحہ ۲۰۲ قدیمی ایڈیشن یا جلد ۹ صفحہ ۱۷۵ نیا ایڈیشن مطبوعہ مصر۔

اس آیت کی ان مختلف تفسیروں کی وجہ سے مفسرین کرام کو یہ کہنا پڑا کہ چار بیویوں کا ثبوت حدیث شریف سے ملتا ہے نہ کہ قرآن مجید سے نواب صدیق حسن خان صاحب تفسیر فتح البیان میں فرماتے ہیں:۔

فَاَولیٰ اَنْ یستدل علی تحریم الزیادۃ علی الاربع بالسنۃ لا بالقرآن۔[2]

پس اولیٰ یہ ہے کہ چار بیویوں سے زیادہ کی حرمت کے لئے حدیث سے استدلال کیا جائے نہ کہ قرآن مجید سے۔

اب وہ حدیث جس سے یہ استدلال کیا جاتا ہے اور اس کی بابت ائمہ حدیث کی رائے ملاحظہ ہو۔ یہ حدیث ابو داؤد اور ابن ماجہ نے روایت کی ہے۔ اور اس کا ترجمہ یوں ہے۔

---

[1] نیل الاوطار شرح منتقی الاخبار جلد ششم صفحہ ۱۵۰

[2] تفسیر فتح البیان۔ جلد ۲۔ صفحہ ۱۶۸

قیس بن حارث کے پاس چار سے زیادہ بیویاں تھیں۔ اسلام لانے کے بعد نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے اسے صرف چار اختیار کر لینے کا حق دیا گیا تھا۔ [1]

ائمہ حدیث کے نزدیک اس حدیث کی صحت تک مشکوک ہے۔ علامہ شوکانی اس حدیث پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں:-

حدیث قیس بن الحارث وفی روایۃ الحارث بن قیس فی اسنادہٖ محمد بن عبد الرحمٰن بن ابی لیلےٰ وقد ضعفہ غیر واحد من الائمۃ [2]

قیس بن حارث کی حدیث میں اور دوسری روایت کے مطابق حارث بن قیس کی حدیث کے ایک راوی محمد بن عبدالرحمٰن بن ابی لیلےٰ ہیں جن کو اکثر ائمہ نے ضعیف قرار دیا ہے۔

علامہ شوکانی مزید فرماتے ہیں کہ حارث بن قیس کی کوئی دوسری روایت نہیں۔ (ایضاً)

تعدد ازدواج اور ائمہ اربعہ

اب تعدد ازدواج کے بارے میں ائمہ اربعہ کی رائے ملاحظہ ہو۔ امام احمد بن حنبل ایک بیوی تک محدود رہنے کو سنت قرار دیتے ہیں۔ ان کا مسلک یہ ہے:-

فالویُندَبُ نکاح امرأۃ واحدۃ فلا یعدد الازدواج فانّ فی التعدد خطورۃ عدم العدل فیقع فی الحرام۔ [3]

صرف ایک عورت سے شادی کرنا مستحب ہے۔ پس ازدواج زیادہ نہ ہوں۔ کیونکہ تعدد ازدواج میں عدل سے ہٹنے کا خطرہ ہے جس سے وہ حرام میں پڑ جائے گا۔

خیال ہے کہ حنابلہ کے نزدیک سنت اور مستحب دونوں مترادف اصطلاحیں ہیں اور ان کا ایک ہی مفہوم ہے۔ [4]

حضرت امام ابوحنیفہؒ نے یک زوجگی کے مسلک کو اختیار بھی کیا اور اسی کی تبلیغ بھی کی۔ تفصیلات ملاحظہ ہو۔ حضرت امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی مطبوعہ کراچی صفحہ ۳۱۷ (پہلا ایڈیشن)

امام شافعیؒ اسلئے یک زوجگی کا مسلک اختیار کرنے کو کہتے ہیں تاکہ لوگ زیادہ عیالدار نہ ہوں [5] اجل

---

[1] نیل الاوطار۔ جلد ششم صفحہ ۱۵۰ [2] ایضاً

[3] الفقہ علی المذاہب الاربعۃ جلد ۴ صفحہ ۱۰ [4] ایضاً جلد ۱ صفحہ ۶۱۴

[5] تفسیر روح المعانی جلد ۴ صفحہ ۱۲۹

مفسرین نے ان کے استدلال کو تسلیم کیا ہے۔

ان تمام اختلافات اور تفصیلات کو سامنے رکھتے ہوئے یہ کیسے تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ تمام ائمہ کا اس پر اتفاق ہے کہ اسلام میں بیک وقت چار عورتوں کو نکاح میں رکھنے کی اجازت ہے۔

طلاق ثلاثہ بیک مجلس (طلاق بدعت)

طلاق ثلاثہ بیک مجلس ایک ایسا مسئلہ ہے جس کے متعلق عائلی قوانین کے مخالفین تک یہ فرماتے ہیں کہ امت میں اسکے بدعت اور معصیت ہونے میں کسی کو اختلاف نہیں۔ انہی کے اپنے الفاظ ملاحظہ ہوں: "بیک وقت تین طلاق دے کر عورت کو جدا کر دینا نصوص صریحہ کی بنا پر معصیت ہے۔ علمائے امت کے درمیان اس مسئلہ میں جو کچھ اختلاف ہے وہ صرف اس امر میں ہے کہ ایسی تین طلاقیں ایک طلاق رجعی کے حکم میں ہیں یا تین طلاق مغلظہ کے حکم میں۔ لیکن اس کے بدعت اور معصیت ہونے میں کسی کو اختلاف نہیں۔ سب تسلیم کرتے ہیں کہ یہ فعل اس طریقہ کے خلاف ہے جو اللہ اور اس کے رسول نے طلاق کے لئے مقرر فرمایا ہے۔ اور اس سے شریعت کی اہم مصلحتیں فوت ہو جاتی ہیں۔ حدیث میں آیا ہے کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو بیک وقت تین طلاقیں دیں تو حضورؐ غصہ میں آ کے کھڑے ہو گئے اور فرمایا۔ اَیُلعَبُ بِکتابِ اللہِ عزّوجلّ وانا بینَ اَظْہُرِکُم (کیا اللہ عزوجل کی کتاب سے کھیل کیا جاتا ہے حالانکہ ابھی میں تمہارے درمیان موجود ہوں) بعض دوسری احادیث میں تصریح ہے کہ حضورؐ نے اس فعل کو معصیت فرمایا اور حضرت عمرؓ کے متعلق تو روایات میں یہاں تک آیا ہے کہ جو شخص اُنکے پاس مجلس واحد میں تین طلاقیں دینے والا آتا تو وہ اسکو درے لگاتے تھے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس فعل پر سزا دیجا سکتی ہے۔"

"ہمارے زمانے میں یہ طریقہ عام ہو گیا ہے کہ لوگ کسی فوری جذبہ کے تحت اپنی بیویوں کو جھٹ تین طلاقیں دے ڈالتے ہیں۔ پھر نادم ہوتے ہیں اور شرعی حیلے تلاش کرتے پھرتے ہیں۔ کوئی جھوٹی قسمیں کھا کر طلاق سے انکار کرتا ہے، کوئی حلالہ کرانے کی کوشش کرتا ہے اور کوئی طلاق کو مخفی رکھ کر اپنی بیوی کے ساتھ بدستور سابق تعلقات باقی رکھتا ہے۔ اس طرح ایک گناہ کے خمیازے سے بچنے کے لئے متعدد دوسرے گناہوں کا ارتکاب کیا جاتا ہے۔ ان خرابیوں کا سدِباب کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ایک ہی وقت میں تین طلاقیں دے کر عورت کو جدا کر دینے پر ایسی پابندیاں عائد کر دی جائیں جنکی وجہ سے لوگ اس فعل کا ارتکاب نہ کر سکیں[1]۔"

---

[1] حقوق الزوجین (سید ابوالاعلیٰ مودودی) طبع ہفتم۔ صفحہ ۱۵۴-۱۵۵۔

ہم نے مولانا ابو الاعلیٰ مودودی صاحب کا یہ لمبا اقتباس اس لئے نقل کیا ہے کہ آجکل یہ مسئلہ پھر سیاست کا شکار ہو رہا ہے۔ ہمارے فاضل مصنف نے تو اس سلسلہ میں اور ہی کمال کر دیا ہے۔ یعنی جو چیز خود عائلی قوانین کے مخالفین کی تصریحات کے مطابق قرآن وسنت کے خلاف ہے اور جس کے معصیت اور بدعت ہونے پر اجماعِ امت ہے اس کی وکالت میں "قرآن وسنت سے براہ راست استدلال فرماتے ہوئے اور بے جا قدامت پسندی سے جنگ لڑتے ہوئے" طلاقِ بدعت کی تائید میں احادیث اس طرح پیش فرمائیں کہ اسے سنت ثابت کر دکھایا ہے) اس سے اور زیادہ نادر تحقیق اور کیا ہو سکتی ہے کہ جس چیز کا نام سن کر حضور صلے اللہ علیہ وسلم غصے میں کھڑے ہو جائیں اور صحابہ اس شخص کو قتل کرنے پر تیار ہو جائیں، آج "قرآن وسنت سے براہِ راست استدلال" کر کے اسی چیز کو سنت ثابت کر کے مروج کرانے کی کوشش کی جائے۔ "بیجا قدامت پسندی کے خلاف جہاد" کا ایسا نمونہ شاید ہی امت کے سامنے آیا ہو۔ یا للعجب! اگر واقعی اس کی تائید میں احادیث ملتی ہیں تو حیرانی کی بات ہے کہ ان احادیث کے ہوتے ہوئے طلاق بدعت ہونے پر کیسے اجماعِ امت ہو گیا اور ان حضرات کو یہ احادیث کیوں نظر نہ آئیں۔

اب ان احادیث پر ایک نظر ڈالئے جو فاضل مصنف نے اپنے اختیار کردہ مسلک کی تائید میں پیش کی ہیں۔ پہلی حدیث کے الفاظ کچھ اس قسم کے ہیں کہ عویمر العجلانی نے اپنی بیوی کو لعان کیا اور پہلے اس سے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تفریق کا حکم دیتے، عُوَیمر نے ایک ہی مجلس میں تین طلاقیں دے دیں۔ اس حدیث سے استدلال یہ کیا جاتا ہے کہ اگر تین طلاقیں دینا جائز نہ ہوتا تو نبی صلے اللہ علیہ وسلم خاموش نہ رہتے کیا فاضل مصنف یہ بتائیں گے کہ اگر لعان کرنے کے بعد کوئی شخص اپنی مجرم بیوی کو طلاق نہ دے تو وہ بدستور اس کی بیوی بنی رہے گی؟

اس حدیث کے آخری ٹکڑے کا ترجمہ بھی انہوں نے خوب کیا ہے۔ عربی الفاظ یہ ہیں:- فکانت تلک بعد سنۃ المتلاعنین — جس کے سیدھے معنی یہ ہیں کہ بعد میں لعان کرنے والوں میں یہ طریقہ رہا۔ لیکن فاضل مصنف اس کا ترجمہ یوں فرماتے ہیں — پس ہمارے لئے یہ سنت (قاعدہ شرعی) ہو گئی کہ لعان کے بعد تفریق کرا دی جائے۔ (صفحہ ۱۹۲) — معلوم نہیں ترجمہ کی اس عجیب تبدیلی سے وہ ثابت کیا کرنا چاہتے ہیں؟

دوسری حدیث جو انہوں نے حضرت عبداللہ بن عمر کے واقعہ کے متعلق پیش فرمائی ہے وہ محدثین کے نزدیک ضعیف ہے۔ علامہ شوکانی اس حدیث کے متعلق فرماتے ہیں:-

وحدیث الحسن فی اسنادہ عطا الخراسانی وھو مختلف فیہ [1]

[1] نیل الاوطار۔ جلد ششم صفحہ ۲۴۲

اس حدیث کی اسناد میں عطا الخراسانی ہے جس کے بارے میں اختلاف ہے۔
حضرت سعید بن المسیب نے اسے جھوٹا کہا ہے اور دوسرے ایک سے زاید ائمہ نے اسے ضعیف قرار دیا ہے۔ (ایضاً)

وَ قَالَ شعبۃ کَانَ نَسِیًّا۔ شعبہ فرماتے ہیں کہ وہ بھول جاتا تھا۔[1]

وَ قال ابن حبان کان مِنْ خِیَارِ عباد اللہ غیر انہ کثیر الوہم سیئ الحفظ یخطی و لا یدری۔[2]

ابن حبان فرماتے ہیں کہ آدمی تو وہ اچھا تھا لیکن سخت قسم کا وہمی اور جلدی بھول جانے والا تھا غلطی کرتا تھا اور اسے علم نہ ہوتا تھا۔

اس کے علاوہ اس حدیث کے ضعیف ہونے کی اور بھی بہت سی وجوہات نقل کی گئی ہیں۔ (ایضاً)

یہی دو حدیثیں ان کا کل سرمایہ تھا جن میں سے ایک ضعیف اور دوسری سے استناد عجیب و غریب!
اس کے بعد حضرت ابن عباس اور حضرت عبداللہ بن مسعود کے دو واقعات پیش کرتے ہیں جن میں انہوں نے اس کے یعنی طلاق ثلاثہ بیک مجلس کے مغلظہ ہونے کے بارے میں رائے دی۔ حضرت ابن عباس کی رائے کے برعکس ان سے ایک حدیث مروی ہے۔ اور فقہاء نے اس کے متعلق یہ فیصلہ دیا ہے۔ المعتبر روایتہ لا رایہ — کہ معتبر ان کی روایت ہے نہ کہ ان کی رائے۔[3]

معاف بفرمائیے فاضل مصنف نے حضرت عبداللہ بن مسعود کا فیصلہ نقل کرنے میں جس بددیانتی سے کام لیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ وہ یہ واقعہ یوں نقل فرماتے ہیں کہ "— ایک شخص عبداللہ بن مسعود کے پاس آیا اور کہا کہ میں نے اپنی عورت کو دو سو طلاقیں دیں۔ ابن مسعود نے کہا کہ وہ عورت تجھ سے بائن ہو گئی —— (موطا امام مالک) میں نے جب موطا امام مالک میں اصل عبارت دیکھی تو حیران رہ گیا کہ یہ لوگ اپنے مسلک کو ثابت کرنے کے لئے کیا کچھ نہیں کر گزرتے۔ اب اصل روایت دیکھیئے اور پھر اس کا فاضل مصنف کے ترجمہ سے مقابلہ کیجئے۔

عَنْ مَالِكٍ أَنَّهُ بَلَغَهُ أَنَّ رَجُلاً جَاءَ الی عبد اللہ بن مسعود فقال إِنِّي طَلَّقْتُ إِمْرَأَتِي ثمانی تطلیقاتٍ فقال ابن مسعود فماذا قیل لك. قیل لی انها قَدْ بانت منی فقال ابن مسعود صدقوا مَنْ طَلَّقَ كَمَا امرہ اللہ فقد بین اللہ لہ و من لبس علی نفسہ لبسا جعلنا لبسہ مُلْطَقًا

---

[1] نیل الاوطار جلد ششم صفحہ ۲۴۲۔ [2] ایضاً صفحہ ۲۲۴ [3] ایضاً صفحہ ۲۲۴۔

یہ لا تلبسوا علی انفسکم و نحملہ عنکم ھو کما یقولون ۔ [1]

امام مالک سے یہ روایت ہے کہ انہیں یہ بات پہنچی ہے کہ ایک شخص حضرت عبداللہ بن مسعود کی خدمت میں آیا اور کہا کہ میں نے اپنی بیوی کو اسّی طلاقیں دیں۔ تو حضرت ابن مسعودؓ نے ان سے پوچھا کہ تجھے کیا کہا گیا؟ اس نے جواب دیا کہ مجھے یہ کہا گیا ہے کہ وہ تجھ سے جدا ہو گئی ہے تو اس پر آپ نے فرمایا کہ انہوں نے سچ کہا۔ جو اللہ تعالےٰ کے بتائے ہوئے طریقہ کے مطابق طلاق دے، تو اللہ تعالےٰ نے وہ واضح کر دیا ہے اور جو اللہ تعالےٰ کے بتائے ہوئے طریقہ کے خلاف گڑبڑ عمل کرے، یہ عمل اس کے اوپر لوٹا دیا جاتا ہے اس برائی سے۔ بچو کہ ہم تمہارا بوجھ اٹھائیں۔ یہ فیصلہ ایسا ہی ہے جیسا کہ لوگ کہتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اگر یہ پورا واقعہ سامنے ہو اور پھر بھی اسے کوئی طلاق ثلاثہ بیک مجلس یعنی طلاق بدعت کے رائج کرنے کی تائید میں پیش کرے تو پھر واقعی یہ "قدامت پسندی کے خلاف جہاد" کی اعلےٰ ترین مثال ہے۔

حضرت ابن مسعود واضح طور پر فرما رہے ہیں کہ یہ طریقہ اللہ تعالےٰ کے بتائے ہوئے طریقہ کے خلاف ہے۔ (یعنی بدعت ہے) اس سے بچو اور آج قرآن و حدیث سے براہ راست استدلال کرنے والے اسے مروج کرانے کے لئے شرعی دلائل دے رہے ہیں۔ یا للعجب!

حلالہ بات یہاں تک ختم نہیں ہو جاتی بلکہ فاضل مصنف اس معصیت سے نکلنے کے راستہ یعنی حلالہ کا ذکر بھی بڑی معصومیت سے فرماتے ہیں کہ گویا وہ بھی کوئی شرعی قاعدہ ہے۔ فاضل مصنف کی معلومات کے لئے عرض ہے کہ یہ ایک غیر اسلامی اور مکروہ عمل ہے جس کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے حلالہ کرنے اور حلالہ کرانے والے دونوں پر اللہ تعالےٰ کی لعنت بھیجی ہے۔ احناف تک اس حدیث کو تسلیم کرتے ہیں -- بقولہٖ علیہ السلام لعن اللہ المحلّل و المحلّل لہٗ۔ (حلالہ کرنے اور کرانے والے دونوں پر اللہ تعالےٰ کی لعنت ہے) حضرت عمرؓ نے اعلان کرا دیا تھا کہ اگر حلالہ کرنے یا کرانے کا کوئی واقعہ ان کے سامنے آیا تو وہ رجم کی سزا دیں گے۔ ایک جدید تعلیم یافتہ شخص کی زبانی ان

---

[1] تنویر الحوالک - جلد ۲ - صفحہ ۱۶

الفاظ کو سنکر تو میرا سر شرم سے نیچا ہو گیا۔

کفاءت فاضل مصنف نے شادی میں کفو کو ضروری قرار دیا ہے اور دفعہ ۷۵ میں چھ امور کفاءت گنائے ہیں۔ (۱) اسلام۔ (۲) نسبت۔ (۳) آزادی۔ (۴) پیشہ۔ (حرفہ)۔ (۵) دیانت۔ (۶) مال و دولت۔ نکاح میں ان امور کی پابندی نہ کرنے پر نکاح فسخ ہو سکتا ہے۔

فاضل مصنف اگر قرآن و سنت سے براہ راست استدلال فرماتے تو ان کا فیصلہ کچھ اور ہوتا۔ حضرت زید اور حضرت زینب کی شادی کے واقعہ کو قرآن حکیم میں ابد تک کے لئے محفوظ کر دیا گیا ہے۔ (ملاحظہ ہو سورۂ احزاب) کیا فاضل مصنف بتا سکتے ہیں کہ یہ چھ ضروری امور اس شادی میں پائے جاتے تھے، یا صرف اسلام ہی قابل اعتبار چیز تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ کفو سے متعلق ان چھ امور کی پابندی سے ہمارے معاشرہ پر کوئی خوشگوار اثر نہیں پڑا۔ بلکہ ایک طرح سے مسلمانوں کے اندر ذات پات کے نظام کو پائیدار بنانے میں معاون ثابت ہوا۔

اس بارے میں امام مالک کا مسلک قرآن و حدیث کے منشاء کے عین مطابق ہے۔ یعنی دونوں کا مسلمان ہونا کافی ہے۔ فاضل مصنف نے بھی اس مسلک کو تشریح کے زیر عنوان صفحہ ۲۶۴ پر نقل فرمایا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جس پہلی اسلامی سوسائٹی کی مدینہ شریف میں تشکیل ہوئی تھی، اس سوسائٹی میں سوائے اسلام کے دوسرے امور کا مطلقاً کوئی خیال نہیں کیا جاتا تھا۔ خیال رہے کہ امام مالک کسی مسئلہ کے متعلق صرف اس وقت فتوے صادر فرماتے تھے جب مدینہ شریف کے کم از کم ستر فقہاء فیصلہ دے دیتے تھے۔ آجکل کے حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے اگر امام مالک کے مسلک کو اختیار کیا جاتا تو زیادہ مناسب ہوتا۔

حق مہر کی کم از کم مقدار دفعہ ۷۰ کے تحت فرماتے ہیں کہ مہر کی کم از کم مقدار ساڑھے تین روپے پاکستانی یا اس کے مساوی قیمت کی کوئی شے ہے۔

ساڑھے تین روپے پڑھ کر راقم الحروف نے بڑی عقل دوڑائی اور زر مبادلہ کے بڑے حساب کئے لیکن کسی طور اس نتیجہ پر نہ پہنچ سکا کہ یہ رقم کس شرح مبادلہ سے نکالی گئی ہے۔ ہمارے فقہاء تو دو صد سالہ پرانی شرح مبادلہ کے مطابق دس درہموں کو اڑھائی روپے قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ اگر ہم نے اس کو اپنی کرنسی ہی کے مطابق کرنا ہے تو یہ مبادلہ ان چیزوں کے مطابق ہو جو عربوں کی اصل دولت تھیں یعنی بھیڑ بکریاں وغیرہ

جس زمانے میں یہ کم ازکم مہر مقرر کیا گیا تھا اس وقت ایک اوسط قسم کی بھیڑ یا بکری صرف تین درہم میں آتی تھی یعنی دس درہموں کی کم ازکم تین بھیڑیں یا بکریاں۔ اب ان کی اگر قیمت نکالی جائے تو حقیقت پسندی کے کچھ قریب ہوگی اور جو کسی حالت میں چار پانچ سو روپے سے کم نہیں بنتی۔

حرفِ آخر جیسا کہ قارئین نے تعدد ازواج اور طلاق بدعت کی بحثوں میں محسوس فرمایا ہوگا اس بارے میں فاضل مصنف نے جو طرزِ عمل اختیار کیا ہے وہ بڑی حد تک عائلی قوانین کے مفاد کے خلاف ہے۔ عائلی قوانین میں لفظی یا اصطلاحی اصلاح کی گنجائش تو ضرور ہوگی لیکن ان میں جو اہم اصلاحی اقدام اٹھائے گئے ہیں ان کے خلاف میدان تیار کرنا "بے جا قدامت پسندی کے خلاف جہاد" کی بڑی ہی انوکھی قسم ہے۔

جس ادارہ کی طرف سے یہ سلسلہ شائع ہو رہا ہے ہم انہیں مشورہ دیں گے کہ ایسے مواد کو اس نیم پختہ حالت میں کسی طور شائع نہ کرایا جائے۔ مناسب ہوگا کہ اس اہم کام میں کچھ اور مستند اہل علم کو شامل کیا جائے۔ یا کم ازکم اسے شائع کرانے سے پہلے ایک سیمینار منعقد کرا لیا جائے۔ اور اس میں اہل علم کے بحث مباحثے کے بعد اسلامی قوانین کے ان مجموعوں کو آخری شکل دی جایا کرے۔

حکیم شمس الرحمٰن خان

فاضل الطب والجراحت (دہلی) ۔ بی ۔ آئی ۔ ایم ۔ ایس (دہلی) ۳۱ سال تجربہ!

برادر شفاء الملک حکیم رشید احمد خان بمبئی ۔ و حکیم ذکی احمد خان ۔ جید پریس ۔ دہلی

مایوس مریضوں کیلئے سنہری موقع

بلڈ پریشر، دق، دمہ، ذیابطیس، گٹھیا، مرگی، بالخرہ، فالج، یرقان، تشنج، نیز مستورات کے پوشیدہ امراض کے خصوصی ماہر ہیں!

اوقات مطب :۔ صبح ۸ بجے سے ۱۲ بجے تک، شام ۵ بجے سے ۸ بجے تک

پتہ :۔ ۱۶۶ ۔ مقابل ڈاک خانہ مصطفےٰ آباد ۔ میو روڈ ۔ لاہور

حقائق و عبر

دین و دانش را غلام ارزاں دہد

ہندوستان کے مسلمان، برہمنی سامراجیت میں جس کرب کی زندگی بسر کر رہے ہیں اس کا ہمیں پوری طرح احساس ہے اور ہماری دلی ہمدردیاں ان کے ساتھ ہیں۔ لیکن وہاں کے ارباب فکر و تدبر جن سے توقع کی جا سکتی تھی کہ وہ ان صبر آزما مراحل میں ہمت سے کام لیں گے اور اپنی قوم کا حوصلہ بلند رکھیں گے۔۔۔ حاکم قوم کی خوشامد میں عام طور پر کس پستی پر اتر آتے ہیں،۔۔۔ اسے دیکھ کر ہمیں بڑا رنج ہوتا ہے۔ بمبئی سے ایک روزنامہ شائع ہوتا ہے ۔۔۔ انقلاب ۔۔۔ عبدالحمید انصاری صاحب اس کے مالک ہیں۔ اس نے اپنی ۲۰ مارچ کی اشاعت میں ایک اداریہ شائع کیا ہے جس کا عنوان ہے ۔۔۔ وہاں بھی سیاست کی زندگی۔۔۔ اداریہ حسب ذیل ہے:

> حج کے موقع پر جب انسان تمام دنیاوی فکروں اور جھگڑوں سے بالکل آزاد ہو کر اس سرزمین میں کھو جاتا ہے جہاں سے تیرہ سو برس پہلے دنیا میں ابدی سچائی اور بنی نوع انسان کے لئے ہدایت کی روشنی پھیلی تھی۔
>
> اگر کوئی فرد یا کسی ملک کا نمائندہ "سیاست" کی دکان سجانے کی کوشش کرتا ہے تو ایک طرح سے وہ حج اور اس کی برکتوں اور عظمت سے انحراف کی کوشش کرتا ہے۔ پاکستان کے وزیر خارجہ مسٹر شریف الدین پیرزادہ نے کچھ ایسی ہی حرکت کی۔
>
> کہنے کو تو مسٹر پیرزادہ نے مکہ معظمہ میں دنیا کے مختلف علاقوں سے وہاں جمع ہونے والے زائرین سے میل ملاپ کے لئے استقبالیہ دعوت کا اہتمام کیا تھا لیکن اس موقع کو جو ایک دوسرے سے ربط قائم کرنے کے لئے استعمال کیا جانا چاہیئے تھا، انہوں نے بڑے بھونڈے طور پر ۱۹۶۵ء کے

ہند پاک تصادم اور مسئلہ کشمیر پر ہندوستان کے حملوں کے لئے استعمال کرنے کی اجازت دیدی اس طرح ان ہندوستانی حجاج کو جو اس تقریب میں مدعو کئے گئے تھے، تقریب سے واک آؤٹ کر جانے پر مجبور کر دیا۔

مسٹر پیرزادہ نے بڑی چالاکی سے کام لیا اور ہندوستان کے خلاف خود کچھ نہیں کہا۔ لیکن بندوق فلسطین کے مفتی اعظم کے کاندھے پر رکھ کر داغنے کی کوشش کی۔ اس طرح وہ دنیا کو یہ دکھانا چاہتے تھے کہ حج بیت اللہ کے موقع پر وہ نہیں بلکہ کسی اور ملک کے نمائندے کشمیر کے لوگوں کے حقوق کی بات کر رہے ہیں لیکن پیرزادہ میزبان تھے اور ان کا یہ فرض تھا کہ وہ اس موقع پر کسی کو سیاسی جھگڑوں میں ملوث ہونے کی اجازت نہ دیتے۔

مسٹر پیرزادہ نے یہ نہیں کیا اس لئے کہ ان کا مقصد ہی ہندوستان کے خلاف دنیا بھر کے زائرین میں پروپیگنڈہ کرنا تھا۔ یہ بات انتہائی افسوسناک ہے کہ حجاز کی مقدس سرزمین پر ایک ایسے ملک کے نمائندے نے سیاسی گندگی پھیلانے کی کوشش کی جو خود کو اسلامی ملک کہتا ہے۔

تقریب میں موجود ہندوستانی حجاج نے واک آؤٹ کر کے مسٹر پیرزادہ اور ان کے حامیوں کو بہت موزوں جواب دیا ہے اور اس کے لئے وہ ہم سب کی مبارکباد کے مستحق ہیں۔

آپ سوچئے کہ پاکستان کے متعلق جس ملک کے "مسلمان" یہ کچھ کہنے پر مجبور کئے جارہے ہیں وہاں کے ہندوؤں کے، اس ملک کے متعلق کیا خیالات اور عزائم ہوں گے؟

۲۔ جمہوریت کے علمبرداروں کے کارنامے

اسی انقلاب اخبار کی ۲۷ مارچ کی اشاعت میں ایک اداریہ شائع ہوا ہے جس کا عنوان ہے — سی۔ آئی۔ اے؛ — اسے بھی ملاحظہ فرمائیے۔

امریکہ کی سنٹرل انٹیلی جینس ایجنسی (محکمہ سراغرسانی) کا نام بہت سے ملکوں میں بہت سے جاسوسی کے کارناموں کے لئے مشہور تھا لیکن ہمارے ملک میں کسی کو اس بات کا شبہ تک نہیں تھا کہ اس محکمہ نے ہمارے کئی اداروں پر بھی اپنا جال پھیلا رکھا ہے۔ یہ بات بڑی دلچسپ ہے کہ اس محکمہ کی ہندوستانی اداروں کے ذریعہ سرگرمی کا انکشاف کسی اور نے نہیں خود امریکہ کے سب سے بااثر اخبار نیویارک ٹائمز نے کیا ہے۔

اگر ایک طرف امریکی جمہوریت میں بے ضرر قسم کے ناموں والے اداروں کے ذریعہ جاسوسی جیسی

"ناپسندیدہ" سرگرمیوں کی اجازت ہے تو دوسری طرف وہاں بنیادی جمہوری حقوق کے آزاد استعمال کی بھی اس سے بڑی علامت اور کیا ہوسکتی ہے کہ وہیں کا ایک ممتاز اخبار ایسے ایسے راز فاش کر دیتا ہے جو نہ صرف حکومت امریکہ کو پریشانی میں مبتلا کر دیتے ہیں بلکہ اس کے کئی دوست ممالک کو بھی حیرت زدہ کر دیتے ہیں۔

امریکہ کے محکمۂ جاسوسی (جو سی۔ آئی۔ اے کے نام سے مشہور ہے) کے متعلق ہندوستان کے بعض اخبارات ایک عرصے سے مخالفانہ نوعیت کی خبریں شائع کیا کرتے تھے۔ لیکن انہیں یہ کہہ کر نظر انداز کر دیا جاتا تھا کہ ان کا تو "پیشہ" ہی امریکہ کی مخالفت کرنا ہے لیکن جب نیویارک ٹائمز نے چند ایسے ہندوستانی اداروں کے نام شائع کئے جن کو سی آئی اے کی طرف سے رقوم مل رہی ہیں تو یہ معاملہ پارلیمان میں بھی بحث کا موضوع بنا اور سرکاری سطح پر بھی اس کی تحقیقات شروع کی گئی ہے۔

لوک سبھا میں اپوزیشن کے کچھ اراکین نے یہ الزام بھی لگایا کہ عام انتخابات کے دوران سی آئی اے کی جانب سے کافی بڑی بڑی رقمیں تقسیم کی گئی تھیں اور کم از کم ۴۴ امیدواروں کو جو اپوزیشن اور کانگرس کے "ترقی پسند" گروپ سے متعلق تھے، چناؤ میں شکست دینے کی کوشش کی گئی تھی۔

چناؤ کے دوران یو۔ پی کے ایک حلقے کے متعلق خاص طور پر یہ شکایت سننے میں آئی تھی کہ وہاں امریکی ڈالروں کی ریل پیل ہے۔ کیا یہ محض اتفاق تھا کہ یو۔ پی کے جس حلقے کے متعلق یہ اطلاعات دی گئی تھیں وہاں سے کانگرس کی ممتاز خاتون امیدوار مسز سچیتا کرپلانی مقابلہ کر رہی تھیں اور ان کے حریف جن سنگھ کے مسٹر اٹل بہاری واجپائی تھے۔ مسٹر واجپائی اس حلقے سے جیت گئے لیکن یہ الزام اپنی جگہ برقرار ہے کہ ان کی شکست کے لئے سی۔ آئی۔ اے کا روپیہ اور ڈالر استعمال کئے گئے تھے۔

وزیر امور خارجہ مسٹر چھاگلا نے لوک سبھا میں سی۔ آئی۔ اے کی سرگرمیوں کے متعلق جو بیان دیا تھا اس سے یہ الجھن دور نہیں ہوتی کہ ہندوستان میں اگر سی۔ آئی۔ اے کی سرگرمی جاری ہے تو وہ کس نوعیت کی ہے اور کن ہندوستانی اداروں کو اس سے مدد ملتی رہی ہے۔ آیا عام چناؤ میں اس نے حصہ لیا تھا اور یہ کہ اس کے لئے اس نے کون سے ذرائع استعمال کئے تھے۔

مسٹر چھاگلا نے یہ اعتراف کیا تھا کہ چونکہ اس ادارے کی جانب سے نہ تو رقمیں براہ راست تقسیم کی جاتی ہیں، اور نہ یہ براہ راست کام کرتا ہے اس لئے یہ پتہ نہیں چلتا کہ اس کا سایہ کس کس پر ہے اور اگر وہ ہندوستانی اداروں کو مالی مدد دیتا ہے تو اس کا مقصد کیا ہوتا ہے؟

سی۔ آئی۔ اے کی سرگرمیوں کے سلسلے میں کچھ عرصہ پہلے ایک امریکی کو جو کسی رضاکارانہ تنظیم کے ممبر بن کر ہندوستان آئے تھے واپس امریکہ بلا لینے کا واقعہ بھی منظرِ عام پر آیا ہے۔ اور جن ہندوستانی اداروں کو سی۔ آئی۔ اے کا پیسہ ملتا ہے ان سے کم از کم دو مرکزی وزراء کے وابستہ ہونے کی بات بھی کہی گئی ہے۔ ایک دلچسپ انکشاف اور بھی کیا گیا ہے کہ جن سنگھ کے صدر مسٹر بلراج مدھوک اور سابق وزیر دفاع مسٹر کرشنا مینن بھی اس معاملے میں ملوث ہیں۔

امریکہ اور ہندوستان دونوں خیر سے جمہوریت کے علمبردار ہیں۔ ان جمہوریت نواز ملکوں میں "جمہور کے ترجمانوں" کے برسرِ اقتدار آنے کے سلسلہ میں جو کچھ کیا اور کرایا جاتا ہے وہ سامنے ہے کیا یہی وہ جمہوریت ہے جسے نوعِ انسان کے لئے آیۂ رحمت قرار دیا جا رہا ہے؟

اور پھر یہ بھی سوچئے کہ امریکن سی۔ آئی۔ اے، جو ہندوستان میں یہ کچھ کر رہی ہے، دیگر ممالک میں کیا کچھ نہیں کر رہی ہوگی؟ یہ ہے دورِ حاضر کی سیاست! — چہرہ روشن اندروں چنگیز سے تاریک تر!

اسکے برعکس اسلام کا نظام ہے جس میں پارلیمان کا حقِ قانون سازی غیر محدود نہیں ہوتا۔ اسے خدا کے عطا کردہ غیر متبدل اصولوں کو اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق رائج کرنے کے لئے تفاصیل طے کرنی ہوتی ہیں۔ ان اصولوں کو اکیاون فیصد تو ایکطرف، سو فیصد ووٹ بھی بدل نہیں سکتے۔ جو شخص ان اصولوں کی صداقت پر ایمان رکھے وہ اس پارلیمان (مجلسِ مشاورت) کا رکن بن سکتا ہے۔ اسلئے اس میں رشوت دے کر یا دوسرے طریقوں سے روپیہ صرف کر کے کوئی پارٹی یا کوئی بیرونی حکومت اپنا کوئی مقصد حاصل کر ہی نہیں سکتی۔ سی۔ آئی۔ اے، سیکولر اسٹیٹ یا مذہبی پیشوائیت کو اپنا آلہ کار بنا سکتی ہے اسلامی نظام کے حاملین کو نہیں۔

سب کی آنکھوں میں دھول جھونکو۔

مشہور ہے کہ "پبلک کا حافظہ بڑا کمزور ہوتا ہے"۔ یہ ہے وہ میکیاولی مفروضہ جس پر جماعت اسلامی کی سیاست کی ساری عمارت استوار ہوتی ہے۔ ان کا مسلک یہ ہے کہ جو کچھ مصلحت کا تقاضا ہو، دھڑلے سے کہہ دو۔ اس کی فکر مت کرو کہ اس سے پہلے تم کیا کر چکے ہو۔ کسے یاد رہ سکتا ہے کہ تم نے پہلے کیا کہا تھا۔ "پبلک کا حافظہ بڑا کمزور ہوتا ہے"۔ اسکی تازہ مثال ملاحظہ فرمایئے۔

جماعت اسلامی کے ترجمان "ایشیا" نے اپنی ۳۱ مارچ ۱۹۶۷ء کی اشاعت میں، ایک طویل اداریہ شائع کیا ہے جس کا عنوان ہے — تحریکِ پاکستان کی صحیح تاریخ محفوظ کرنے کی ضرورت — اس میں، علامہ اقبال کے مختلف بیانات کے اقتباسات دے کر یہ ثابت کیا گیا ہے کہ "پاکستان کی

تحریک خالص اسلامی بنیادوں پر اٹھائی گئی تھی۔ اور (۲) اس میں "قومیت" کے تصور کا شائبہ تک نہیں تھا۔ چنانچہ اس اداریہ میں ان اقتباسات کے بعد لکھا ہے۔

> ہم ان طول و طویل اقتباسات کے لئے معذرت خواہ ہیں۔ کیا ان میں کہیں جذبۂ قومیت کی کوئی تڑپ نظر آتی ہے۔ ہم حیران ہیں کہ تحریک پاکستان کو قومی تحریک ثابت کرنے کی آخر کیا ضرورت پیش آ رہی ہے۔ کیا اسلام پاکستان کی ترقی میں مانع ہے یا محققین کی خواہشاتِ نفسی کی مطلب براری میں حائل ہے؟ ہم محسوس کرتے ہیں کہ ہم ایک ایسے دوراہے پر پہنچ چکے ہیں جہاں پوری صفائی اور دیانت سے فیصلہ کرنے کی ضرورت ہے کہ مطالبۂ پاکستان کا اصلی محرک کیا تھا؟ — اگر اصلی محرک اسلام ہی تھا تو پھر محض ان چند نفس پرست دانشوروں کے لئے پوری قوم کو انتشار کا شکار کیوں بنایا جا رہا ہے جو نہ اسلام پر عمل کرنا چاہتے ہیں اور نہ اس پر ایمان لانے کو ان کا دل چاہتا ہے۔ آخر یہ کہاں کی دانشوری اور کہاں کی جمہوریت ہے کہ ایک حقیر سی اقلیت پوری قوم کو محض اس لئے بدراہ کرنے پر تل جائے کہ اتفاق سے اس کے ہاتھ میں اقتدار کی کنجیاں پہنچ گئی ہیں۔

'ایشیا' کے اس تبصرہ سے واضح ہے کہ

(۱) پاکستان کا اصلی محرک اسلام تھا۔

(۲) جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ اس کا محرک اسلام نہیں بلکہ جذبۂ قومیت تھا، وہ "نفس پرست" ہیں اور قوم کو انتشار کا شکار بنا رہے ہیں۔

آئیے! یہ دیکھیں کہ یہ خیال کس نے پھیلایا تھا کہ پاکستان کا اصلی محرک جذبۂ قومیت تھا اور اسے اسلام سے دور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔ جس نے بھی یہ خیال پھیلایا تھا وہ خود ایشیا کے فیصلہ کے مطابق "نفس پرست" تھا اور قوم میں "انتشار پھیلانے" کا موجب!

جماعت اسلامی کے امیر مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے تحریک پاکستان کی مسلسل مخالفت کی۔ اس مخالفت کے سلسلہ میں انہوں نے ببانگِ دہل کہا کہ

> مسلم لیگ کے کسی ریزولیشن اور لیگ کے ذمہ دار لیڈروں کی کسی تقریر میں آج تک یہ بات واضح نہیں کی گئی کہ ان کا آخری مطمحِ نظر پاکستان میں اسلامی نظامِ حکومت قائم کرنا ہے۔

(سیاسی کشمکش حصہ سوم۔ مطبوعہ ترجمان القرآن۔ جلد ۱۰۔ عدد ۵۔ ۲)

بلکہ وہ یہاں تک بھی کہتے تھے کہ

> افسوس کہ لیگ کے قائدِ اعظم سے لے کر چھوٹے مقتدیوں تک ایک بھی ایسا نہیں جو اسلامی ذہنیت اور اسلامی طرزِ فکر رکھتا ہو اور معاملات کو اسلامی نقطۂ نگاہ سے پرکھتا ہو۔
>
> (ترجمان القرآن - ذی الحجہ ۱۳۵۹ھ صفحہ ۳۳)

اس کے ساتھ ہی وہ مسلسل پراپیگنڈا کئے جاتے تھے کہ یہ تحریک ایک خالص "قومی" تحریک ہے۔ وہ "اسلام کا نظریۂ سیاست" میں اس تحریک پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> دس سال تک مسلمانوں کی قومی تحریک اس انداز سے چلائی گئی کہ مسلمانوں کا ذہن پہلے سے زیادہ پراگندہ، ان کا اخلاق پہلے سے زیادہ خراب اور ان کے اجتماعی اوصاف پہلے سے زیادہ گئے گذرے ہو گئے۔

پاکستان بننے سے ذرا پہلے، انہوں نے (۲۶ اپریل ۱۹۴۷ء کو مدراس میں تقریر کرتے ہوئے) کہا کہ

> اگر یہ مسلمان، قوم پرستانہ سیاست کی راہ اختیار کرنے کے بجائے اس راہ (یعنے مودودی صاحب کی تجویز کردہ راہ) کو اختیار کرتے .. .. تو آج ہندوستان کی سیاست کا نقشہ بالکل بدلا ہوا ہوتا۔

پاکستان میں پہنچنے کے بعد، انہوں نے ترجمان القرآن کی جولائی ۱۹۴۸ء کی اشاعت میں لکھا۔

> دس سال پہلے مسلمانوں کے سامنے یہ سوال آیا تھا کہ وہ ہندو امپریلیزم کے تسلط سے اپنے آپ کو کیسے بچائیں۔ اس سوال کا ایک حل یہ پیش کیا گیا تھا کہ اسلام کے اصولوں اور اسلامی سیرت کی طاقت سے اس خطرہ کا مقابلہ کیا جائے۔ مگر اس حل کو مسلمانوں نے قبول نہ کیا اور وہ اسے آزمانے پر آمادہ نہیں ہوئے۔ اب یہ بحث بیکار ہے کہ اسے آزمایا جاتا تو کیا ہوتا۔ دوسرا حل جو پیش کیا گیا تھا یہ تھا کہ قومیت کی بنیاد پر سیاسی جنگ لڑی جائے۔ اس حل کو مسلمانوں نے قبول کیا اور اپنی ساری قومی طاقت، اپنے تمام ذرائع اور اپنے جملہ معاملات اس قیادت کے حوالے کر دیئے جو ان کے قومی مسئلہ کو اس طرح حل کرنا چاہتی تھی۔

کیا ان شواہد کی روشنی میں اس حقیقت کے اثبات کے لئے کسی اور دلیل کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے کہ یہ خیالات (کسی اور کے نہیں) خود جماعت اسلامی کے امیر، مودودی صاحب کے پھیلائے ہوئے ہیں۔

یہ ہے ان لوگوں کی دلیری کا عالم! لیکن اس میں مدیرِ ایشیا کا کوئی قصور نہیں۔ ان لوگوں کو ان کے امیر

کی طرف سے تعلیم ہی یہ دی جاتی ہے کہ مصلحت وقت کے مطابق جس بات کو مفید مطلب سمجھو اسے دھڑلے سے کہہ دو اور اس کا قطعاً خیال نہ کرو کہ تم اس سے پہلے کیا کہہ چکے ہو! آپ نے اوپر دیکھا ہے کہ مودودی صاحب تحریک پاکستان کے دوران کس قطعیت کے ساتھ کہتے تھے کہ۔

> مسلم لیگ کے کسی زیر ولیوشن اور لیگ کے ذمہ دار لیڈروں کی کسی تقریر میں آج تک یہ بات واضح نہیں کی گئی کہ ان کا آخری مطمح نظر پاکستان میں اسلامی نظام حکومت قائم کرنا ہے۔

لیکن پاکستان بننے کے بعد انہی مودودی صاحب نے اسی جرأت کے ساتھ یہ اعلان فرمایا۔ کہ

> میں آپ کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ قیام پاکستان کی جدوجہد میں جو کچھ آپ کو سمجھایا گیا تھا وہ یہ تھا کہ پاکستان سے مقصود ایک ایسی حکومت کا قائم کرنا ہے جس کا نظام خدا کی پاک کتاب اور اس کے رسول محمدؐ کی سنت پر مبنی ہو اور تمام مسلمان اسلامی اصولوں کے مطابق زندگی بسر کر سکیں۔ لیڈروں کے ذہن میں اس وقت کچھ بھی ہو، کم از کم زبانوں سے، انہوں نے ہر سٹیج اور ہر منبر پر کھڑے ہو کر یہی کہا تھا اور عام مسلمانوں نے ان کے انہی دعووں اور ان کے ظاہر کردہ انہی ارادوں پر یقین کر کے پاکستان کی تحریک میں ان کا ساتھ دیا تھا۔ (دستوری سفارشات پر تنقید، ص۷)

سو جس جماعت کے امیر کی یہ کیفیت ہو، اگر اس کے متبعین لوگوں کی آنکھوں میں یہ سمجھ کر دھول جھونکنے کی کوشش کریں کہ کسے یاد رہتا ہے کہ کل ہم نے کیا کہا تھا۔ ان پر تعجب کیا ہو سکتا ہے؟ میکیاولی سیاست چلتی ہی اس طرح ہے۔

باقی رہی ایشیا کی یہ تجویز کہ تحریک پاکستان کی صحیح تاریخ محفوظ کر دی جائے، تو ہم انہیں مخلصانہ مشورہ دیں گے کہ وہ اس بات کو بھولے سے بھی زبان پر نہ لائیں۔ وہ غنیمت سمجھیں کہ تحریک پاکستان کی صحیح تاریخ محفوظ نہیں ہو رہی۔ اگر وہ تاریخ لوگوں کے سامنے آگئی تو آپ کی جماعت ایک دن کے لئے بھی ٹھہر نہیں سکے گی۔

رشتے کی ضرورت

(۱) ۲۴ سالہ گریجوایٹ شریف سلیقہ شعار نا کتخدا لڑکی کیلئے شریف برسرروزگار رشتے کی ضرورت ہے۔

(۲) ۲۲ سالہ لڑکے کیلئے جو ملک کی مشہور لیبارٹری میں پروڈکشن منیجر بھی ہے (اوورسیز کمرشل پائلٹ بھی) شریف سلیقہ شعار کم از کم ایف۔اے لڑکی کا رشتہ درکار ہے۔

خط و کتابت:۔ (ص) معرفت ادارہ طلوع اسلام۔ ۲۵/بی گلبرگ لاہور

بابُ المراسلات

۱۔ ہماری شادیاں

لائلپور سے ایک صاحب دریافت فرماتے ہیں کہ از روئے قرآن،

(۱) خاوند کے فرائض کیا ہیں؟

(۲) بیوی کے فرائض کیا ہیں؟

(۳) مروجہ شادیاں رسم و رواج کی زنجیروں میں جکڑی ہیں اور لوگ غیر محسوس بتوں کے سامنے سجدہ ریز ہیں نتیجہ یہ ہے کہ یہ تقریب ایک ہنگامہ سے کم نہیں۔ قرآن کی رو سے اس تقریب کے کیا خدوخال ہیں قرآنی احباب چاہتے ہیں کہ وہ شادیاں قرآن کی روشنی میں کریں۔

طلوعِ اسلام۔ قرآن کریم کی رو سے، نکاح ایک ایسے پیمانِ وفا کا نام ہے جس کی رُو سے ایک عاقل، بالغ جوڑا باہمی رفاقت کا معاہدہ کرتا ہے۔ مقصد اس سے یہ ہوتا ہے کہ اس باہمی رفاقت سے وہ ایک دوسرے کی ذات کی نشوونما کا موجب بنیں۔ اور ایک ایسے خاندان کی بنیاد رکھیں جو انسانی شرف و مجد کا حامل اور قرآنی پیغام کو آگے بڑھانے کا موجب ہو۔

قرآن نے اس رشتہ کی خصوصیت یہ بتائی ہے کہ اس سے میاں بیوی میں "مودت، رحمت، اور سکینت" کے تعلقات استوار ہوں گے۔ ظاہر ہے کہ جس رشتہ کی بنیاد، مودت، رحمت اور سکینت پر ہو، اس میں حقوق اور فرائض کے امتیازی حدود کیا ہوں گے؟ اگر اس رشتہ میں حقوق و فرائض کی فہرستیں مرتب ہونی شروع ہو جائیں تو وہ بزنس (کاروبار) ہوگا، سودائے محبت نہیں رہے گا۔ اقبال تو اس پیمانِ وفا کے متعلق یہاں تک کہتا ہے کہ ؎

یک نگہ ۔ یک خندۂ دزدیدہ ۔ یک تابندہ اشک

بہر پیمانِ محبت ، نیست سوگندے دگر!

اگر کسی نے حقوق و فرائض کا تعین کرنا ہے تو اس کے لئے قرآن کریم نے ان کی فہرست دینے کے بجائے ایک اصول بیان کر دیا ہے۔ اور وہ یہ کہ

وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ (۲/۲۲۸)

بیوی پر جو ذمہ داری عائد کرو اس کے مثل اس کا ایک حق قائم ہو جائے گا۔ یعنی اس میں (RECIP - ROCITY) کا اصول کارفرما ہوگا ۔۔۔ جس قدر حقوق اسی قدر ذمہ داریاں ۔ اور جس قدر ذمہ داریاں اسی قدر حقوق۔

البتہ انسان کی تمدنی زندگی اور عورت کو اولاد کی پیدائش اور پرورش کے سلسلے میں جو فرائض دینے پڑتے ہیں ان کے پیشِ نظر یہ اصولی راہ نمائی بھی دیدی گئی ہے کہ ۔۔ اَلرِّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَآءِ (۴/۳۴) عورتوں کو چونکہ اپنے طبیعی فرائض کی بجا آوری کے لئے کسبِ معاش کی فرصت نہیں مل سکتی اور مرد ان فرائض سے فارغ ہوتا ہے اس لئے گھر کے اخراجات کی ذمہ داری مرد کے سر ہے۔ باقی سب زندگی کے مختلف گوشے ۔ سو ان میں مرد اور عورت دوش بدوش چلتے ہیں ۔ (دیکھئے ۳/۲۸)

جہاں تک اس کی تقریب اور اس کے ہنگامے کا تعلق ہے ۔ سو یہ ایک معاشرتی سوال ہے ۔ قرآن نے اس کے متعلق کوئی تفصیل نہیں دی ۔ نہ ہی اس کی ضرورت تھی۔ یہ ایک معاہدہ ہے جس طرح اور معاہدات طے پاتے ہیں اسی طرح اسے بھی طے پا جانا چاہیئے۔ اس خوشی میں اگر کوئی اپنے احباب کو شریک کرنا چاہتا ہے تو یہ اس کی مرضی ہے (جسے دعوتِ ولیمہ کہا جاتا ہے ، وہ عربوں کے ہاں ایک معاشرتی رسم تھی جس طرح عقیقہ ان کے ہاں کی رسم تھی ۔) ۔۔۔ لیکن اس سلسلہ میں جو کچھ ہمارے ہاں ہو رہا ہے ، قرآن کی روشنی میں وہ یکسر اسراف ہے ۔۔۔ یہ اسراف اور وہ بھی اس قوم میں جو روٹی کے ٹکڑے کے لئے دوسروں کی محتاج ہے یا للعجب! اس سے امراء کی دولت برباد ہوتی ہے اور غریبوں کی لڑکیاں محض (ان فضول رسموں کے لئے) پیسہ نہ ہونے کی وجہ سے بیچارے ماں باپ کے لئے استخوان شکن بوجھ اور اپنے لئے آتشِ خاموش کی بھٹی بنی رہتی ہیں ۔۔۔ اور یہ سب کچھ بلا کسی پیرم و خدا کے ، محض معاشرہ کی اس تباہ کن روش کی وجہ سے۔

جہاں تک مہر کا تعلق ہے ، وہ ایک تحفہ ہے جو خاوند بیوی کو از رہِ محبت پیش کرتا ہے۔ اس کی مقدار [illegible] کوئی تعیین [illegible] نہیں۔ البتہ اس کی ادائیگی ضروری ہے ۔۔۔ خواہ نکاح کے وقت ہو یا اس کے بعد ۔۔۔ [illegible] جہیز کے لئے قرآن میں کوئی حکم نہیں۔ جو ہوتے وقت شوہر جہیز طلب کرتا اور اس کی شرطیں عائد

کرتا ہے وہ محبت و رفاقت کا معاہدہ نہیں کرتا، سودے بازی کرتا ہے۔ اور جس رشتہ کی ابتدا ہی سودے بازی سے ہو، اس کا انجام معلوم!

بس یہ ہے نکاح از روئے قرآن ——— باقی سب کچھ ہماری خود ساختہ زنجیریں ہیں جن میں ہم اپنے آپ کو خود ہی جکڑتے ہیں اور پھر ساری عمر روتے رہتے ہیں۔

یذبحون ابناءھم

لائل پور سے آمدہ ایک خط ملاحظہ فرمائیے۔

"[میرا بڑا لڑکا تیسری جماعت میں پڑھتا ہے۔ آج صبح مجھ سے پوچھنے لگا۔ آپ کہتی تھیں "میری سرکار" مکہ شریف میں پیدا ہوئے تھے اور "بچوں کی دنیا" میں لکھا ہے کہ وہ پکا چک۔ اوکاڑہ میں پیدا ہوئے؟ اس بات پر میں حیران رہ گئی اور فوراً میں نے "بچوں کی دنیا" کا سالنامہ (اپریل ۱۹۷۲ء) پڑھنا شروع کیا۔ اس کے ایڈیٹر جناب محمد امین شرقپوری صاحب ہیں۔ اور ایڈیٹر کے قلم سے ایک مضمون ہے ——— میری سرکارؒ ——— یہ ہے قصہ حضرت کرماں والے کا جو پچھلے سال انتقال کر گئے۔ سنا ہے مجذوب قسم کے پیر صاحب تھے واللہ اعلم۔ یہ رسالہ محکمہ تعلیم کا منظور شدہ ہے۔ اور بڑا خوبصورت ہے۔ "میری سرکارؒ" کے عنوان سے ایڈیٹر صاحب نے جو مضمون لکھا ہے وہ طویل ہے۔ میں صرف ایک دو اقتباسات پیش کر رہی ہوں۔

•…… اگر کسی شخص کے پیٹ میں کوئی تکلیف ہوتی تو آپ اُسے فرماتے کہ جا میرے کنوئیں کا پانی پی لے۔ اللہ خیر کرے گا۔ اس طرح وہ تکلیف دور ہو جاتی……"

•…… ایک دفعہ درگاہ حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری کے گدی نشین نے حضرت قبلہ کو خط لکھا کہ آپ اجمیر تشریف لاویں کیونکہ حضرت خواجہ غریب نواز آپ کو یاد فرماتے ہیں۔ اور آپ جب اجمیر گئے تو درگاہ خالی کرالی گئی…… آپ اندر داخل ہو گئے اور دروازہ بند کر لیا۔ آپ فرماتے ہیں حضرت خواجہ غریب نواز اپنی قبر سے باہر نکلے اور انہوں نے گفتگو فرمانے کے بعد مجھے شانوں سے پکڑ کر خوب جھنجھوڑا۔ اور فرمایا کہ میں نے یہ کام اس لئے کیا ہے کہ آپ کو مضبوط بناؤں……"

اب آپ ملاحظہ فرمائیں کہ اس سائنسی دور میں جبکہ ہمارے سامنے کام کرنے کی راہیں متعین ہیں اور جو لوگ وقت کا ساتھ نہ دیں گے نقصان اٹھائیں گے، ایسی چیزیں بچوں کو پڑھائی جا رہی ہیں ——— ہمیں اس سے

انکار نہیں کہ یہ لوگ اللہ کے بندے تھے۔ لیکن یہ کیسے تسلیم کریں کہ وہ تیروں سے نکل کر باتیں کرتے تھے۔ ہمارے بچوں کے ذہنوں پر ان غلط باتوں کا اثر ہو رہا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اپنے دین کی تعلیمات اسلام کی روشنی ہیں ۔۔ قرآن کی روشنی میں عام ہوں اور ایسی کہانیاں پڑھائی جائیں جن سے بچوں کا کردار مضبوط ہو اور حقیقت پسندی کی طرف راغب ہوں۔ اگر آپ ایسے واقعات کی روشنی میں "طلوع اسلام" میں لکھتے ہیں اس لئے آپ کی اطلاع کے لئے لکھا جا رہا ہے۔ نیز اس خط کی نقول دو تین اخبارات میں بھی بھیجی جا رہی ہیں۔

طلوعِ اسلام اس پر ہم اس کے سوا اور کیا تبصرہ کریں کہ ۔۔۔ سینہ تمام داغ داغ پنبہ کجا کجا نہم ۔۔ جس طرح عمر کے انحطاط کے زمانے میں جسم کے تمام قویٰ کمزور ہو جاتے ہیں، اسی طرح ایک زوال آمادہ قوم کی زندگی کے ہر گوشے میں خرابیاں سرایت کر جاتی ہیں، کس کس کا رونا رویا جائے۔

لاہور اور کراچی میں ماہنامہ طلوعِ اسلام اور ادارہ کی کتابیں

مندرجہ ذیل مقامات سے طلب فرمائیں

لاہور

۱۔ انٹرنیشنل بک سروس ۔۔ ۵، دی مال لاہور
۲۔ کلاسیک بک سیلرز ۔۔ ۔۔ ۴۲ دی مال "
۳۔ سیلز پبلشنگ ہاؤس ۔۔ ۔۔ ۲۷ دی مال "
۴۔ کو اپریٹو بک شاپ ۔۔ ۔۔ ۷ دی مال "
۵۔ لاہور بک ڈپو ۔۔ ۔۔ ۶۵ دی مال "
۶۔ بک سنٹر ۔۔ ۔۔ چوک رنگل دی مال "
۷۔ ادبستان ۔۔ ۔۔ ۔۔ چوک لکشمی لاہور
۸۔ آئیڈیل بک ہاؤس ۱۹۴ انارکلی "
۹۔ مکتبۂ پاکستان چوک انارکلی "
۱۰۔ گوشۂ ادب چوک انارکلی "
۱۱۔ اسمٰعیل اینڈ برادرز چوک انارکلی "
(۱۲) نیشنل بک سٹال ۔۔ ۔۔ ۔۔ چوک انارکلی لاہور
(۱۳) ماڈل بک سٹال ۔۔ ۔۔ ۔۔ ٹولنٹن مارکیٹ دی مال "
(۱۴) اورینٹل بک سٹال ۔۔ ۔۔ گلبرگ ۲ ۔ لاہور
(۱۵) سیلز پبلشنگ ہاؤس المنار مارکیٹ، چوک انارکلی لاہور

کراچی :۔ (۱) محترم محمد اسلام صاحب ۴/۱۰۰ لوئیس روڈ نیو ٹاؤن کراچی ۵ ۔ فون ۔ (۲۳۵۸۸۰)
(۲) ہر اتوار کی صبح ۹ بجے تا ۱۲ بجے سندھ اسمبلی ہال ۔ بندر روڈ۔
(۳) گلڈ زانجمن کتاب گھر۔ وکٹوریہ روڈ ۔ صدر۔
(۴) عوامی کتب خانہ ۔ بولٹن مارکیٹ۔
(۵) شیخ شوکت علی اینڈ سنز۔ بندر روڈ ۔ کراچی۔
(۶) جنرل بک ڈپو ۔ فریئر روڈ نزد حبیب بنک ۔ کراچی۔
(۷) اقبال کتاب گھر ۔ سمرسٹ سٹریٹ ۔ کراچی صدر۔

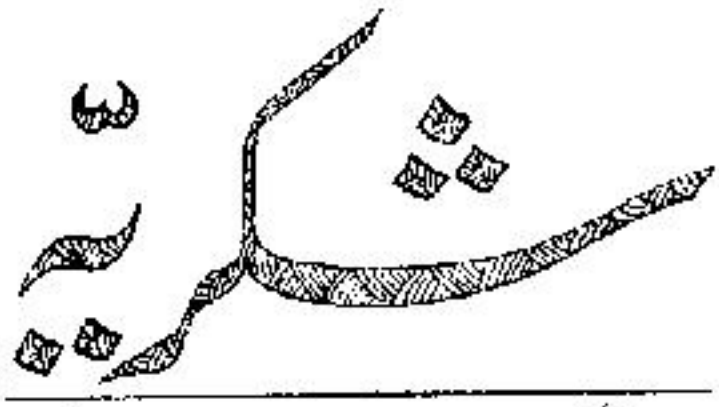

بخدمت گرامی محترم صدر مملکت پاکستان

ہم نے مارچ ۱۹۶۷ء کی اشاعت میں، محترم صدر مملکت کی خصوصی توجہ اس حقیقت کی طرف منعطف کرائی تھی کہ ملک کے نظامِ تعلیم میں جو دوعملی پائی جاتی ہے — وہ دوعملی جس کی رُو سے مذہبی تعلیم مکتبوں اور دارالعلوموں میں دی جاتی ہے اور "دنیاوی" تعلیم اسکولوں اور کالجوں میں — اس سے قوم کی زندگی میں وہ ثنویت پیدا ہو رہی ہے جسے مٹانے کے لئے اسلام آیا تھا۔ اس سے پاکستان کی سالمیت مخدوش ہو رہی ہے۔ کیوں کہ پاکستان کی تو بنیاد ہی اس نظریہ پر تھی کہ اسلام کی رو سے "دین اور سیاست" میں کوئی بُعد نہیں۔ یہ دونوں ایک ہیں۔ ہم نے گزارش کیا تھا کہ حکومت اس ثنویت کو ختم کرنے کیلئے مناسب اقدام کرے۔

مقامِ تشکر ہے کہ صدرِ محترم نے اس ضرورت کا شدید احساس فرمایا۔ چنانچہ انہوں نے لاہور اور ڈھاکہ میں، اساتذہ کی کانفرنسوں میں اس خطرہ کو دہرایا۔ انہوں نے ڈھاکہ میں فرمایا۔

> یہ امر موجبِ تشویش ہے کہ ملک میں دو قسم کا نظامِ تعلیم رائج ہے۔ ایک بالکل مذہبی، دوسرا اکیسر سیکولر۔ یہ اسلام کے خلاف ہے، جو دینی اور دنیاوی اقدار کو یکجا کرنے کیلئے آیا تھا۔ اگر یہ ثنویت جاری رہی تو خطرہ ہے کہ ملک کا بیشتر تعلیم یافتہ طبقہ دین سے بیگانہ ہو کر دوسرے نظریاتِ حیات کی طرف رُخ کرے گا۔ اس کا نتیجہ آخر الامر مایوسی ہوگا۔ ان ہر دو نظامہائے تعلیم کو ایک دوسرے میں مدغم کرنا معاشرے کے لئے نہایت ضروری ہے۔
>
> (پاکستان ٹائمز۔ ۳ر اپریل ۱۹۶۷ء)

اس تجویز کو عمل میں لانے کے لئے انہوں نے جدید نصابی کمیٹی کی تشکیل فرمائی ہے جو اس تجویز

کو عملی شکل دینے کے لئے نصابِ تعلیم کی سفارشات کرے گی۔ یہ مبارک اقدام ہے۔ لیکن اس سلسلہ میں ہماری گزارش یہ ہے کہ یہ مقصد نصابی کمیٹیوں کی تشکیل سے حاصل نہیں ہو سکے گا۔ یہ ایک عظیم انقلابی اقدام ہے جس کے لئے ملک گیر جدید نظامِ تعلیم وضع کرنے کی ضرورت ہوگی۔ اس کے لئے ضروری ہوگا کہ :-

(۱) ملک میں صرف اسکول اور کالج رہیں۔ مذہبی مکاتب اور دار العلوم بند کر دیئے جائیں۔

(۲) نصابِ تعلیم میں الگ اسلامیات کا شعبہ نہیں رہنا چاہیئے۔ اس لئے کہ اس الگ شعبہ سے پھر وہی ثنویت پیدا ہو جاتی ہے۔ (یہ "اسلامیات" کیا ہے اور اسکے نتائج کیا، اس کے متعلق ہم تفصیل سے کبھی پھر لکھیں گے۔)

(۳) نصابِ تعلیم ایسا ہو کہ طلباء کو جو مضمون بھی پڑھایا جائے، اس میں بتایا جائے کہ قرآن کریم اس باب میں کیا تعلیم دیتا ہے۔ اور اس کے ماحصل کو کس طرح اسلام کی پیش کردہ مستقل اقدار انسانیت کے تابع رکھا جا سکتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی انہیں روزمرہ کی زندگی میں ان امور سے روشناس کرا دیا جائے جن کی سرانجام دہی کے لئے آجکل ایک الگ مولوی کی ضرورت لاحق ہوتی ہے۔

(۴) اسلامی قانون کے بنیادی اصولوں کی تعلیم لا کالج میں دی جائے۔

جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے نظامِ تعلیم کی یہ تبدیلی کوئی معمولی تبدیلی نہیں۔ یہ بہت بڑی تبدیلی ہوگی۔ اس لئے اس کے لئے بڑے عزم، ہمت، محنت اور تدبر کی ضرورت ہوگی۔ لیکن اگر یہاں یہ تبدیلی پیدا ہو گئی تو ہم یقینی طور پر کہہ سکتے ہیں کہ پاکستان کو عالمِ اسلام ہی میں نہیں، اقوامِ عالم میں ممتاز ترین مقام حاصل ہو جائیگا۔ اس لئے کہ

(۱) جس قوم میں مذہبی پیشوائیت مؤثر ہوگی وہ قوم کبھی مقامِ آدمیت تک نہیں پہنچ سکے گی۔ اور

(۲) جو قوم خدا کی طرف سے عطا کردہ مستقل اقدار سے بے بہرہ رہے گی، اسے انسانیت کی سطح نصیب نہیں ہو سکے گی۔

"دین اور دنیا" کی تعلیم کے ادغام سے مراد یہ ہے کہ مذہبی پیشوائیت کو ختم کر کے، قوم کے نوجوان طبقہ کو مستقل اقدارِ خداوندی سے روشناس کرایا جائے۔ اس سے یہ صحیح مقامِ انسانیت تک پہنچ سکیں گے۔ اس نصب العین کو سامنے رکھ کر اس کی طرف تدریجاً بڑھتے چلے جانا چاہیئے۔ واللہ المستعان

رابطۂ باہمی

بزم لاہور پورے عزم و ثبات سے مجلہ طلوع اسلام کے پیش کردہ پیام اور متعلقہ لٹریچر کی اشاعت کے پروگرام کو آگے بڑھانے میں تگ و دو کر رہی ہے۔ اور اب یہ آواز فضا میں پھیل کر تعلیم یافتہ طبقہ بالخصوص کالجوں کے طلباء و اساتذہ کو متاثر کرتی جا رہی ہے۔ اس کا اثر ہفتہ وار درس قرآن میں شامل ہونے والوں اور اس پروگرام کی توسیع کے ساتھ ہم آہنگ احباب میں بتدریج اضافہ کی صورت میں رونما ہو رہا ہے۔

مسلسل درس قرآن اب ستائیسویں پارے کے ربع تک پہنچ چکا ہے۔ سورۃ والنجم کے معجزانہ اسلوب بیان، سیرت رسالتمآب صلے اللہ علیہ وسلم اور پیام قرآن کی ہمہ گیری کے متعلق محترم پرویز صاحب کی زبان سے پیشتر بھی اسکے خطابات میں جستہ جستہ حقائق فردوس گوش ہوتے رہے ہیں لیکن جس تفصیل و توضیح کے ساتھ مسلسل درس میں آیات متعلقہ کی حقیقت کشائی ہوتی ہے وہ سامعین میں وجد آور کیفیت انہماک پیدا کر رہی ہے۔

بزم کراچی سے ہفتہ وار رپورٹیں نہایت باقاعدگی سے آ رہی ہیں جن سے مترشح ہوتا ہے کہ بزم کے جواں ہمت ناظمہ محمد اسلام صاحب اور انکے رفقا، اپنی جملہ رضاکارانہ ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لئے حالات کی ناسازگاری کے باوجود پوری تندہی سے جادہ پیما ہیں۔ بزم کے ماہانہ اجلاس، ہفتہ وار درس قرآن اور دیگر سرگرمیوں میں تازہ اضافے — آغاخان جم خانہ میں کتابوں کی نمائش پر طلوع اسلام کا لٹریچر پیش کرنا اور اسمٰعیلیہ لائبریری کراچی سے رابطہ استوار کرنے کی مساعی ہیں۔

بزم راولپنڈی کے ماہانہ و ہفتہ وار اجتماعات باقاعدہ ہوتے ہیں۔ مجلہ طلوع اسلام کی تازہ اشاعتوں میں شمولہ خصوصی مقالات اور انکے متعلق پوسٹرز راولپنڈی میں نہایت مؤثر ثابت ہوئے ہیں۔ پمفلٹ "طاقت تک انقرآن" ارباب فکر و نظر میں بہت پسند کیا گیا اور اسکی وجہ سے تحریک کا تعارف کئی نئے گوشوں میں ہوا۔ نتیجتاً ہفتہ وار اجتماعات درس قرآن میں بھی اب نسبتاً زیادہ احباب شریک ہوتے ہیں۔

بزم مردان جناب خان عبدالحکیم خان صاحب اور انکے رفقا کے زیر اہتمام درس قرآن کا سلسلہ بدستور جاری ہے۔

ماہ مارچ تک یہ درس سورۃ انبیاء (سترہواں پارہ) تک پہنچ چکا ہے۔ طلوع اسلام کے خصوصی مقالات کے پوسٹر جو نوٹس بورڈوں اور چوراہوں پر چسپاں کر لئے جاتے ہیں انکا نتیجہ خاطر خواہ نکل رہا ہے۔ جو مقامی اصحاب وقت رسالہ طلوع اسلام خریدنے کی استطاعت نہ رکھتے ہوں، بزم انہیں رسالہ بلاقیمت اور تحریک کی کتابیں بھی مطالعہ کے لئے مہیا کرتی ہے۔

بزم میانوالی کے نمائندہ محمد شریف لون صاحب اور انکے احباب بزم کی کوششیں تحریک طلوع اسلام کی توسیع واشاعت کے لئے دور و نزدیک مقامات پر بدستور جاری ہیں اور بھکر میں بھی اب ایک علیحدہ بزم کی تشکیل پیش نظر ہے۔ میانوالی شہر میں محترم لون صاحب متعدد ارباب فکر و نظر کو تحریک سے روشناس کرا چکے ہیں۔

بزم دیونہ منڈی کے نمائندہ محترم محمد صدیق صاحب اور انکے رفقائے کار کی پرخلوص اور انتھک مساعی کے صلہ میں مجلہ طلوع اسلام اور تحریک قرآنی کا لٹریچر کتنے ہی گھرانوں تک پہنچ رہا ہے۔ ارباب بزم اب اپنے ہاں ٹیپ کے ذریعہ درس قرآن اور ایک لائبریری کے اجرا کیلئے انہماک سے کوشاں ہیں اور امید واثق ہے کہ وہ اسے عملی جامہ پہنا کر رہیں گے۔ دیونہ منڈی کے علاوہ محترم محمد صدیق صاحب کی کوشش اور دسالمت سے گوجرانوالہ کے دلدادگانِ تحریک میں محترم احمد حسن صاحب نے اپنے ہاں ٹیپ کے ذریعہ درس قرآن کی پیشکش کی ہے جو عنقریب جاری ہوگا۔

بزم برمنگھم فورڈ (انگلستان) کے نمائندہ محترم دین محمد صاحب نے ایک حالیہ خط میں اپنی قابل قدر سرگرمیوں کا ذکر مندرجہ ذیل الفاظ میں کیا ہے۔

"۲۶ مارچ کو بزم کا دوسرا اجلاس منعقد ہوا۔ انگلستان کے دیگر مقامات سے بھی لوگوں نے شرکت کی۔ محترم پرویز صاحب کا خطاب ابلیس کی مجلس شوریٰ "بذریعہ ٹیپ سنایا گیا۔ اس مرتبہ لوگ اس تعداد میں مجتمع تھے کہ مشکل سے کھڑے ہونے کے لئے جگہ ملتی تھی۔ رات کے گیارہ بجے کے بعد احباب اپنے اپنے گھروں کو رخصت ہوئے (شام کے کھانے کا بندوبست پہلے سے کر لیا گیا تھا) اراکین بزم نے مجلہ طلوع اسلام کی عام اشاعت پر پھر زور دیا اور تدابیر سوچیں کہ کس طرح قرآنی فکر کو عام کیا جائے۔ ملے پایا کہ انگلستان کی لائبریریوں میں جن مقامات پر پاکستانی (اور اردو دان) موجود ہیں، کتب مہیا کی جائیں تاکہ لوگوں میں قرآنی تعلیم کا شوق پیدا ہو۔ لندن میں محترم مقبول فرحت صاحب اور پرسٹن میں راجہ عبدالرزاق صاحب، خواجہ عارف صاحب و بشیر احمد صاحب کے نام قابل ذکر ہیں کہ جس شوق اور جذبہ سے اس کام کو سرانجام دے رہے ہیں وہ واقعی قابل رشک ہے۔ اکثر احباب بزم مجلہ طلوع اسلام کے کم از کم دو پرچے خریدتے ہیں۔ کچھ احباب ایسے ہیں جو محترم پرویز صاحب کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے خواہش مند ہیں کہ انہوں نے اس قدر محنت و کاوش سے ہماری آنکھوں سے پٹی کھولی ہے۔ سامعین ایسا محسوس کرتے ہیں جیسے کوئی نئی زندگی ملی ہے۔ شام کی نماز کے بعد دعا مانگی گئی کہ باری تعالیٰ محترم پرویز صاحب کو ایک لمبی عمر اور صحت عطا عطا فرمائے تاکہ وہ قوم اور ملت کی مزید خدمت کر سکیں۔

بزم نے اپنا ایک فنڈ مشروع کر دیا ہے جو تمام تر تحریک کے فروغ کے سلسلے میں صرف ہوگا۔ انگلستان کے کئی بڑے بڑے شہروں میں نمائندگان تحریک متعین ہو چکے ہیں۔ جہاں سے طلوع اسلام کا لٹریچر بغیر کاوش کے دستیاب ہو سکتا ہے۔ پرسٹن میں درس قرآن بذریعہ ٹیپ سنانے کا انتظام عنقریب مکمل ہو جائے گا۔"